خطبات ابوالکلام آزاد

قیمت :- چار روپے آٹھ آنے

ناشر :- المنار اکاڈمی ، لاہور

طابع :- انشا پریس ، لاہور

مقدّمہ

قیامت کے روز جب داورِ حشر کے سامنے مسلمانانِ ہند کا مقدمہ پیش ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ استغاثے کے گواہوں میں شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شیخ احمد سرہندی، اورنگ زیب عالمگیر اور ٹیپو سلطان کے ساتھ مولانا ابوالکلام کو بھی بلایا جائے گا۔ جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ مسلمانانِ ہند کو انہوں نے ایک حیات افروز اور پیغمبرانہ انداز کے ساتھ دعوتِ حق دی مگر انہوں نے اس آوازِ صور پر بیدار ہو کر میدانِ عمل کی طرف بڑھنے کی بجائے خود بلانے والے کو اتنا مایوس کر دیا کہ وہ ان سے منہ موڑ کر دوسری جانب روانہ ہو گیا۔

آج سے تیس پینتیس برس پیشتر جب ہندوستان کے مسلمان سیاست میں ساحرِ افرنگ سے شکست کھا کر "امنا بالطاغوت" کا نعرۂ عجز و خود فراموشی بلند کر چکے تھے اور سر سید مرحوم کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر جابرانہ قوت کے سامنے سربسجود ہو چکے تھے، یکایک کلکتہ سے ایک رعد آسا صدا بلند ہوئی۔ جو یکایک تمام ہندوستان میں گونجی اور مدہوشوں کو ہوشمند اور سوئے ہوؤں کو بیدار کر گئی۔ یہ صدا ایک گمنام نوجوان کے ہونٹوں سے بلند ہوئی تھی جو نظم اور زبان کی حیرت انگیز خداداد طوفانی انگیزیوں کے ساتھ ہندوستان کے شہر خموشاں پر چھا گیا تھا۔ پورا ملک حیرت و استعجاب کے ساتھ اپنے دل سے سوال کرنے لگا تھا کہ بیسویں صدی میں یہ قم باذن اللہ کون پکار اٹھا، اور یہ احمد المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی مدیر الہلال کون ہے۔ جس کے کلام میں جادو، زبان میں سحر اور تحریر میں اعجاز ہے۔ جو زبان کی کاٹ سے غافل دلوں کی بستیوں کو الٹ دیتا اور بھولے ہوئے حق

کی طرف اس قوتِ اعجاز کے ساتھ بلاتا ہے کہ جو اس کی بات کو سمجھتا ہے وہ بھی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتا ہے اور جو نہیں سمجھتا وہ بھی مبہوت ہو کر ادھر ہی کی راہ لیتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جن کو آج حکومت نے کسی نامعلوم مقام میں محبوس کر رکھا ہے اور جن کو نظر انداز کر دینے کی دعوت دے کر پرانے حریف تمام ملک میں پھر گئے ہیں. قید میں ہیں مگر ان کی تقریریں، ان کی تحریریں اور ان کے ارشادات پرانے اوراق میں سے نکل نکل کر گلستانِ علم و ادب کی رونق بن رہے ہیں۔

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

وقت کی سیاست نے مسلمانوں کو ابوالکلام کی سیاست سے محروم کر دیا مگر ان کے قلم اور زبان سے نکلے ہوئے جملے اور فقرے آج بھی دلوں کے محبوب اور دماغوں کو مرغوب ہیں. مولانا ابوالکلام آج بھی کانگریس کے فرمانروا نہیں بلکہ دل اور دماغ کی مملکت کے تاجدار ہیں، اور زمانہ بادلِ ناخواستہ بھولے ہوئے افکار کے انبار میں سے ان موتیوں کو نکال نکال کر محفلِ زیست کی رونق بنا رہا ہے۔ جو ابوالکلام کے جواہر نگار قلم اور گوہر بار زبان سے ٹپکے تھے۔

ابوالکلام کی خطابت کا اندازہ صرف وہ خوش قسمت لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے اس جادو بیان مقرر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ بعض لوگ ان کو ہندوستان کا ڈیماستھینز کہتے ہیں۔ کچھ بدذوق انہیں گلیڈاسٹون اور سسرو سے تشبیہ دیتے ہیں. حالانکہ ابوالکلام کی خطابت کو ڈیماستھینز اور سسرو اور گلیڈاسٹون کی خطابت کے ساتھ مماثلت دینا ابوالکلام کی خطابت کی توہین ہے۔ اور بلا شائبہ ریب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس پائے کا مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا۔ ذرا ابوالکلام کے خطبے کو پڑھو۔ اس میں بجلی کی کڑک رعد کی گرج۔ دریا کی روانی سبزہ زاروں کی طراوت پہاڑوں کا شکوہ۔ گلستانوں کا جمال ناہید کا نغمہ کچھ اس طرح حسین تناسب کے ساتھ گھلا ملا ہوا ملے گا کہ انسان محسوس کرے گا میں وادیِ کشمیر کی سیر کر رہا ہوں۔

میں نے مولانا ابوالکلام کی سب سے پہلی تقریر اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں سنی ایک

اکہرے بدن کا سفید رنگ کا نوجوان۔ گویا کسی نے ہاتھی دانت کا انسانی قالب بنا کر اس میں روح پھونک دی ہے۔ سبزادئی رومال عمامے کی صورت میں سر پہ بندھا تھا۔ گویا عرب کے کسی اجتماع سے کوئی آتش بیاں خطیب مجمع کو مبہوت کر کے ہندوستان میں آگیا ہے۔ یا پھر حُسنِ بیان مجسم ہو کر جلوہ آفریں ہے "ای سفر دوسری تقریر رات کو موچی دروازے کے باہر ہوئی میں نے اُسے بھی سُنا تیسری تقریر گجرات میں۔ اور چوتھی امرتسر میں سنی۔ ہر موقع کا تاثر آج تک یہ ہے کہ گیس کے ہنڈوں کی روشنی کی کرنوں پر رقص کرتا ہوا مضامینِ تازہ کا ایک سیلاب ہے جو اسٹیج پر سے ایک غیر معلوم چشمے سے اُبل رہا ہے۔ اور وسیع مجمع پر ابرِ بہاری کی طرح محیط ہے سننے والے دم بخود دل ہی دل میں وجد کر رہے ہیں۔ فرمودات کی حقانیت، استدلال کی پختگی۔ زبان کی لطافت الفاظ کی شوکت اور اندازِ بیان کی پاکیزگی دل و دماغ عقل اور جذبات دونوں کی صفوں کو یکساں مسخر کرتی جا رہی ہے۔

امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے۔ مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے آذان کی صدا بلند ہوئی۔ خطیب تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔ میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقررین کی تقریریں سنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔

خطباتِ ابوالکلام میں مولانا ابوالکلام آزاد کی متعدد تقریریں آپ کو ملیں گی! میرا گمان ہے کہ مطالعے کے دوران میں آپ بھی اس کیفیت کو محسوس کریں گے۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز

اتحادِ اسلامی

اجلاسِ عام ——————— کلکتہ

۲۷ را کتوبر ۱۹۱۴ء

اے اقوامِ یورپ! اے رہروانِ قافلۂ انسانیت! اے
شمائلِ زندگی و سبعیت! اے مجمع وحوش و کلاب! یہ ظلم و عدوان
تا کجے؟ اور یہ خون و خونریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے
حیوانی غرور سے ناپاک رکھوگے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور یہ
روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟

برادرانِ اسلام!

۱ عرصہ کی خاموشی کے بعد پھر میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں!

تحقیقِ حالِ ما زِ نگہ مے تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ بعض اسباب خاص سے اس عاجز نے عام مجالس کی شرکت قطعاً بند کر دی تھی، اور گزشتہ (خضر پورہ) کی مجلس میں التجا کی تھی کہ آئندہ سے اِس خدمت سے معاف رکھا جاؤں۔ ارکانِ انجمن نے جب اس کی نسبت ایک خط لکھا تو پہلے جی میں آیا کہ معذرت کے ساتھ انکار کر دوں۔ لیکن اِس کے بعد سوچا کہ وقت تو وہ آگیا ہے. جب گونگے بولنے لگیں، اندھے دیکھنے لگیں اور بہرے سننے لگیں کیونکہ اسلام اپنے پیرو سے اُس کے آخری فرض کا طالب اور اس شئے کا خواستگار ہے۔ جس کے بعد اس کے ذمہ اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ اور وہ توحید الٰہی کے حق سے سبکدوش ہو جائے گا۔ پس جو زبان نہیں بول سکتی اس کو بھی بولنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اور جو قدم نہیں اٹھ سکتا اُس کو بھی چلنے کے لیئے اٹھنا چاہیے۔

قرآن حکیم نے توحید کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو سراجِ منیر ملقب کیا اور ان کے

خصائص کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا	اے نبی بے شک ہم نے تم کو شہادت
وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	دینے والا، بشارت پہنچانے والا
بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا	ضلالت و خباثت سے خوف دلانے

والا، اللہ کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا۔

لیکن ایک دوسرے موقعے پر آفتاب کو بھی سراج کے لقب سے یاد کیا ہے۔

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا	اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی
وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا	بنایا جو ایک نور ہے اور سورج کو

بھی بتایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے۔

اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ جب آفتاب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ و ادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلاتمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشاں سماء رسالت کی عموم فیضان بخشی کا تھا، جو کوہ سعیر سے چلا مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں دہنی جانب شریعت الٰہی کی نور و کتاب مبین تھی مگر بائیں جانب تمام عدل و میزان کی شمشیر آبدار چمک رہی تھی۔ جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروزمندی تھا۔ کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوتے تھے، لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِ	رات کی قسم جب کہ اس کی تاریکی
اِذَا تَجَلّٰى وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ	کائنات کی تمام اشیاء کو چھپا دیتی ہے اور روز

وَالضُّحیٰ — روشن کی قسم جب کہ آفتاب کی تجلی تمام کائنات کو روشن کر دیتی اور در اصل اس خالق کی قسم جس نے تخلیقِ آدم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔

اس آفتابِ توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق و انفقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود و ابیض اور عرب و عجم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خدا کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ رب العالمین تھا۔ پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی رحمۃ للعالمین ہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خود فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے۔ جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ	اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمہاری
ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ	خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا تعلق
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ	رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ	کر دیا، اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ

ورنہ در اصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں اور امتیاز اور شرف اسی کے لیے ہے۔ جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک نشان ضرور تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس کو وہ کسی انسانی

تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا۔ انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اُس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفان، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، اور زمین کے دور دراز گوشوں، اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً	بیشک تمہاری جماعت ایک ہی جماعت
وَّاحِدَةً ۡ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ	ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں

اے برادرانِ ملت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور روحانی اسلام کی دعوت تھی جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستانِ حجاز میں ظہور کیا۔ مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوارِ چین سے صدائے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظریں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں، عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے سینکڑوں ہاتھ تھے جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لیے وضو کر رہے تھے۔ یہ تمام دنیا کی مختلف قومیں، زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعے پھر ایک جگہ جمع کر دیا اور ان کے روٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریکِ رنج و راحت ہو گئے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ	اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو جو تم
عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ	پر نازل کی گئی جب کہ تم اسلام

أعداءً فألّفَ بينَ	سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن
قلوبكم فأصبحتم بنعمتِهِ	تھے مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں
إخوانًا۔	الفت و محبت پیدا کر دی اور دشمن

یکبارگی ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا۔ جو اقرار کرے اس برادری میں شامل ہو گیا۔ خواہ مصری ہو خواہ نائجیریا کا وحشی ہو خواہ قسطنطنیہ کا تعلیم یافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے جس کا گھرانا کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے روٹھ جائے بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہدِ مودت، خاندان اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبت ٹوٹ جائیں، مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے، ایک عرب کے بدو کو تاتار کے چرواہے سے اور ایک ہندوستان کے نو مسلم کو مکہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوست و یک جان کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے۔ جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسان کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے جکڑ دیا ہے۔

پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلہ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے۔ تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیِ وطن کے حلقِ بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے

منہ سے دل وجگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو، اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحے کے لیے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیرووں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضا و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضا کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہورہ کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔

مثل المؤمنین فی توادھم	مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و رحمت
وتراحمھم وتعاطفھم مثل	اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے
الجسد اذا اشتکی لہ عضو	ایک جسم واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو
تداعی لہ سائر الجسد بالسھر	میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا
والحمی	جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔

اور اس کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے۔

المومن للمومن کالبنیان	ایک مومن دوسرے مومن کیلئے ایسا

یشد بعضہ بعضاً (متفق علیہ) ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں، کہ ایک اینٹ دوسری کو سہارا دیتی ہے۔

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے اوّلین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع ومانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ:۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ کافروں کے لیے نہایت سخت، مگر

بَيْنَهُمْ آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد۔

ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لیے۔ اور ان کی جس قدر محبت والفت ہے حق اور صدق اور اسلام وتوحید کے لیے۔

جب سے اسلام دنیا میں موجود ہے، یہ اخوت اور وحدت بھی موجود ہے۔ مگر یورپ جدید وسیلۂ شیطانی اس کو کبھی ہول الحال اور حدیث العہد اسلامی اتحاد سیاسی سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس انضمامِ اسلام کی تعبیر اُس کو ایک خوں فشاں ہلال کی صورت میں نظر آتی ہے۔ وہ کسی ایسے وقت کے تصور سے اپنے تئیں لرزاں وترساں ظاہر کرتا ہے جب کہ تمام عالم میں چالیس کروڑ مسلمانوں کی تلواریں یکایک چمک اٹھیں گی۔ عیسائیوں سے اُن کے گزشتہ چار سو سال کی مسیحی خونریزی کا حساب لیا جائے گا۔ اور تمام دنیا کے درختوں پر صلیب پرستوں کی معلق اور مصلوب لاشیں اُن کے خدائے مصلوب کی لاش کی طرح لٹکنے لگیں گی۔

میں نے جب کبھی اس قسم کی تحریریں پڑھی ہیں تو لکھنے والوں کے تعصب پر اس قدر متعجب نہیں ہوا ہوں جس قدر اس کے جواب دینے والے مسلمانوں کی جہالت بلکہ اسلام فروشی پر۔ جب کبھی یورپ کے شیاطینِ سیاست نے "پان اسلام ازم" کی صدا بلند کی ہے تو معاً مسلمانوں نے ڈر ڈر کر اور کسی خونی مجرم کی طرح سہم سہم کر اپنی بریت کے بے اثر دلائل کی وظیفہ خوانی شروع کر دی ہے۔ اور پھر اکثر اوقات غیروں کے خوش کرنے کے لیے اس میں اس درجہ غلو کیا ہے کہ خود اپنے تئیں بھول گئے ہیں۔

لیکن حضرات! یقین کیجیے "پان اسلام ازم" کا فرضی خطرہ جس غرض مخفی سے دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے، بہت کم مسلمان ہیں جن کی نظر اُس کی حقیقی علت پر ہوگی۔ اس اعلان کے خطرہ پر بریت اور احتیاط کی کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد جہل نہیں بلکہ ایک نہایت بخت ابلیسانہ حکمتِ عملی ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمان پان اسلام ازم کے جرم سے کانوں پر ہاتھ دھریں، ان کو خود یورپ سے پوچھنا چاہیے کہ مسئلہ مشرقی کی حقیقت کیا ہے؟

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آج نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمتِ عملی وضع کی ہے۔ اور اس کا نام مشرقی مسئلہ یا مشرق کا فیصلہ آخری" رکھا ہے۔ مشرقی مسئلہ کی حقیقی غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے بقیہ قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے، اور بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جس قدر حصے اسلام کے زیرِ اثر باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی تقسیم مساوی کے ساتھ آپس میں بانٹ لیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اظہر من الشمس فی نصف النہار ہے۔ اور جس شخص نے کم از کم گذشتہ دس برسوں کے اندر کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کر لیں وہ بغیر کسی بصیرت مزید کے اسے دیکھ سکتا ہے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ ایک خنجر اسلام کے قلب میں پیوست کر دینے کے لیے تیز کیا جا رہا ہے۔ تو کیا مضائقہ اگر ہم کسی ڈھال کی تیاری میں معروف ہوں! اگر خدا پرستی سے مسیح پرستی کی دشمنی قدیمی ہے اور یہ کوئی نئی کی سازش نہیں، تو پیروانِ توحید کا عمل مشرکین سے دفاع کون تعجب ہے، مگر یہ یورپ کے چہرۂ خونی کا عکس ہے، جو اس کو عالم اسلامی کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔ اس کے بچنے کے لیے اتحاد و اخوت بھی کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ یورپ جانتا ہے کہ مشرقی مسئلہ کی حکمتِ عملی کے لیے کوئی بچاؤ اگر اسلام کے پاس ہے تو صرف اس کا حقیقی اتحاد اسلامی ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا اس پر متفق ہو جانا ہے۔ اپنی قدیمی سیادت اور شرف کو محفوظ رکھیں اسلامی زندگی کی آخری انسانی

تلوار صرف ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک ترکی حکومت جس کے قیمتی اجزا پر مسئلہ مشرق کی قینچی چل چکی ہے۔ مسیحی اتحاد کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے۔ البتہ اگر چالیس کروڑ قلوب اسلامیہ ہلال کے نیچے جمع ہو جائیں تو پھر وہ ایک ایسی قوت ہے جس کو سیکڑوں سکندر اور ہنے بال بھی مل کر فنا نہیں کر سکتے۔ یورپ چونکہ یہ جانتا ہے کہ غفلت اور اغراض پرستی نے مقامی وطنی سرشاریوں میں مسلمانوں کو مبتلا کر دیا ہے اور اُن کے باہمی بین الملی اتحاد کے جسم میں مغربی اتحاد کے جراثیم پیدا ہو چکے ہیں۔ اس لیے گو فی الحقیقت کسی ایسے اسلامی اتحاد کا وجود نہیں ہے۔ لیکن وہ وقت سے پہلے پیدا ہونے والی مقاومت کا استیصال کرنا چاہتا ہے اور اس مشہور قاعدہ کی رو سے کہ" اتقاء وقوع المرض خیر من معالجۃ بعد وقوعہ" اسلام کے فنا کرنے سے پہلے اُس کے بچاؤ کی ڈھال کو فنا کر دینے کی تدبیروں میں مصروف ہے۔

پھر کیا ہو گیا ہے ان ملاحدہ مسلمین اور متفرنجین مارقین کو جو "پان اسلام ازم" کا نام سنتے ہی جامہ سے باہر ہو جانا کا نعرہ لگانا شروع کر دیتے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ ہماری یورپ پرستی اور اسلام دشمن کی پُر امن وفاداری میں کوئی اسلامی اتحاد خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ کیا وہ اس لگاؤ و بہتری سے ٹھیک اس غرض وغایت کو پورا نہیں کرتے جو اس عمل شیطانی سے خود یورپ کے پیش نظر ہے۔؟

پروفیسر ویمبری جس نے اٹھارہ برس کی عمر سے تیس برس تک ترکوں کا نمک کھایا اور اُس کے بعد ہمیشہ بحیثیت ایک اسلام پرست اور عثمانی بہی خواہ دوست کے خلیفہ کی شاہانہ مہمان نوازیوں سے متمتع ہوتا رہا ہے کل کی بات ہے کہ "بوڈاپسٹ ہیرلڈ" میں اسی تمہید کے اعادہ کے بعد وہ مسلمانوں کا رد سنت ہی لکھ رہا تھا۔

"اسلام کی حمایت سے اب کوئی فائدہ نہیں، وہ عنقریب فنا ہو جائے گا۔ اور اس کو فنا ہی ہو جانا چاہیے۔ مسلمان ایک ایسی وحشی قوم ہے جس میں نہ تو طبیعت

کا وجود ہے اور نہ طبیعت کہ وہ محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کو صرف خدا کی عبادت گزاری آتی ہے۔ مگر دنیا میں کام کرنا نہیں آتا۔ انسانی حس و شعور ان سے سلب ہو گئے ہیں۔ صرف ایک دینی جذبہ ان میں باقی ہو۔ نہ انکا کوئی مسلک و رنہ کائنات میں مقصد پس اب یورپ کیلئے یہی باقی رہ گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے آپس میں بانٹ لے"۔

یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست کی آواز تھی، لیکن دشمنوں کو کہاں ڈھونڈیں پروفیسر مکسین ہارڈن، جو آسٹریلیا کے سب سے بڑے اخبار "وزنگٹن" کا مالک اور چیف ایڈیٹر ہے، چند سال ہوئے ہیں کہ اس مسئلہ مشرقی پر لیکچر دیا تھا اور اس کا خلاصہ "لنڈن ٹائمز" نے شائع کیا تھا۔ مجھ کو یاد ہے کہ اُس کی آواز ان جملوں پر اکثر رُکی تھی۔

"اب اور کب تک اسلام کو آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ کہ وہ اپنی ہزار سالہ وحشت و خونخواری کے واقعات بیسویں صدی میں دہراتا رہے۔ کب تک اپنی باہمی رقابت کے ہاتھوں عالم انسانیت کی مظلومی کا تماشہ دیکھتا رہے گا۔ اسلام ایک خطرہ ہے، اور اس کا بقا تمام تر خطرہ۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یورپ اسلام سے جو زمین کا ٹکڑا لیتا ہے وہ اس کا قدرتی حق ہے اور دول یورپ کے لیے مالِ غنیمت ہے۔ جس کی واپسی کا خیال بھی جنون ہے"۔

یورپ اسلام کے چالیس کروڑ نفوسِ انسانی کو تمدن اور تہذیب کے نام سے فنا کر دینا بیسویں صدی کی سب سے بڑی مدنی خدمت سمجھتا ہے۔ لیکن روس میں آج کئی ملین عیسائی موجود ہیں، جو عثمانیوں سے ہزار درجہ یورپین تمدن سے بعید ہیں۔ سب سے پہلے اس خنجر تہذیب کی دھار کی مستحق اُن کی گردنیں کیوں نہیں سمجھی جاتیں! اور اگر جس تہذیب کے نام پر یہ صلیبی جنگ جاری کی گئی ہے۔ اگر یہ وہی تہذیب ہے۔ جس کی ٹریجڈی ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مادی تمثالِ تمدن نے طرابلس میں دکھائی تھی، تو ہزار سلامتی ہو تجھ پر اے وحشت و خونخواری، اور ہزار ہزار رحمت و برکت نازل ہو تجھ پر اے افریقہ اور نائجیریا کی بربری اور

درندگی! اور تیرے سایہ برکت سے ہمارے سر جدا نہ ہوں۔

حضرات! یورپ کے نزدیک مسئلہ مشرقی کا حال بالکل ایک قدرتی انصاف و عدل ہے۔ چالیس کروڑ نفوس اسلام کو مٹا دینے کا عملی تہیہ کوئی تشویش انگیز بات نہیں یہ اس پرانی مسیحی وصیت کی تبلیغ و تکمیل ہے۔ جس کو سینٹ لوقا" نے شہزادہ امن مسیح کی زبانی دنیا کو سنایا تھا۔ کہ میرے وہ دشمن جو نہیں چاہتے کہ میں ان پر حکمرانی کروں ان کو یہاں لاؤ اور میرے قدموں کے آگے ذبح کر دو۔

پس اس میں کوئی انسانی ظلم نہیں۔ قوموں کے قدرتی قوانین کا احترام اس بارے میں بالکل بے معنی ہے۔ اگر کوئی شئے قابلِ توجہ ہے تو صرف یہ ہے کہ یورپ کی رقیب حکومتیں ایک دوسرے پر بازی نہ لے جائیں۔ جسم اسلام کی اس طرح بوٹیاں نوچی جائیں کہ ہر بھیڑیے کے منہ میں مساوی تقسیم کے ساتھ ایک ایک لقمہ آجائے۔ لیکن جامعہ اسلامیہ اسلام کی قدرتی اخوت۔ اس کا روزِ اول سے قائم کردہ رشتہ اتحاد، تو یہ ایک سخت سے سخت معصیت اور جرم ہے جس کا کوئی ذی روح مخلوق مجرم ہو سکتا ہے یہ ایک کھلا ہوا عدوان اور فساد ہے۔ یہ وحشیانہ تعصب اور بربرانہ خون خواری کی سازش ہے یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے نفرین اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی تاریک زندگی ہے، جو صرف اس لیے ہے کہ اسے مٹا دیا جائے۔

لیکن اے اقوام یورپ! اے وندال قافلۂ انسانیت! اے مثالی درندگی و بہیمیت! اے مجمع وحوش و کلاب! ظلم و عدوان تا کجے! اور خون و خونریزی تا چند! کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے! کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی! تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر لٹک رہی ہیں۔ طرابلس کی ریت پر اب تک ان جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں جو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ایک ایک شیرو نے بہایا۔ مراکش میں لاشوں کا شمار کوئی انسان

نہیں کر سکتا جن میں سے سینکڑوں کو مٹی کے بوجھ کی جگہ تمہارے گھوڑوں کی سموں کا پامال کیا اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں۔

یہ تمہارے تمام خباثت شیطانی دنیا کے لیے تہذیب و تمدن کی رحمت اور امن و صلح کی برکت ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آٹھ سو اٹالین قیدی "عزیزیہ" اور "ہارون" کے صحرائی قبائل کی قید میں دن میں پانچ مرتبہ اس غذا سے بہتر غذا کے سامنے بٹھائے جاتے ہیں، جو فوج طرابلس کے افسر عام کو نصیب ہوتی ہے۔ اُس سے پوچھو تو وہ کبھی "پین اسلام ازم" سے اپنے تئیں بے خطر نہ دکھلائے گا۔ کیونکہ وہ دانستہ آپ کی ایک اصلی مدافعانہ قوتِ اتحادی کو اس طرح فنا کر دینا چاہتا ہے۔ آپ انکار کریں خواہ اقرار بعد دونوں حالتوں میں اس کا سلوک یکساں ہوگا۔

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ	اُس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر اس
تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ	کو بہکا دو جب بھی زبان باہر نکالے رہے گا
يَلْهَثْ	اور اگر اسکو چھوڑ دو جب بھی زبان ہلا دیگا۔

اور عین اس وقت جب کہ نخلستانِ طرابلس میں مسلمانوں کے شیر خوار بچوں اور خانہ نشین عورتوں کا قتلِ عام کیا جاتا ہے ڈیڑھ سو سے زیادہ اٹالین قیدیوں کو نشانات بے خاص اپنا خیمہ دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ریگستان کی گرد اور تپش کے عادی نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اسلام اور اسلام کے محافظ ترک وحشت و بربریت کا پیکر ہیں۔ اور صرف تہذیب و شائستگی کی تکمیل کے لیے ان کو مٹا دینا چاہیے۔

پس اے برادرانِ ملت! جس "پین اسلام ازم" کو یورپ پیش کر رہا ہے، اگرچہ اس کے وسائس آفرین دماغ سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔ مگر اس سے بریت کی بے فائدہ کوشش نہ کیجیے، جس چیز کو آپ اپنی بریت میں پیش کریں گے اس سے وہ بے خبر نہیں ہے۔ آپ اپنی بریت کے اظہار میں آجکل کے ملاحدہ مسلمین کی طرح خواہ اپنی جنسِ اسلامی

کہ جنسِ مغربی سے کیوں بدلتے ہیں۔

مسلمان تو پان اسلام ازم کے نام پر استغفار پڑھ رہے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کاش مسلمانوں میں پان اسلام ازم کا وجود ہوتا۔ وہ پان اسلام ازم جس کو ترکی یا انگلستان کے مسلمانوں کی کسی مخفیہ کمیٹی کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ روز اول سے اس کی ہم کو دعوت دی گئی ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً	ایک دین الٰہی کی رسی سب مل کر
وَلَا تَفَرَّقُوْا۔	پکڑ لو اور آپس میں متفق ہو۔

اگر پان اسلام ازم کا اصلی وجود ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ ہمارے سامنے ایران پر قیامت گزر جاتی، مراکش کا خاتمہ ہو جاتا، طرابلس میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتیں اور ہمارے قلوب میں کوئی حقیقی حرکت پیدا نہ ہوتی؟ روضہ مبارک حضرت امام رضا علیہ السلام کی دیواریں ملاعنہ روسیہ کی گولہ باری سے گر گئیں۔ برقہ کی مسجدوں کے مناروں پر اٹلی کے مشرکین و مریم پرست چڑھ گئے تاکہ عین اس مقام پر جہاں خدائے واحد کی تقدیس و تسبیح کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں، رومن کیتھولک بت پرستی کا علم نصب کریں۔ مجھ کو بتلاؤ کہ کتنے ہندوستان میں مسلمان ہیں جن کے دلوں میں زخم لگے۔ اور کتنے ہیں جن کے دلوں میں ٹیسیں اٹھیں؟ سچ یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی پان اسلام ازم کو کھو چکے ہیں۔ اور یہی علت حقیقی اسلام کے اصلی ضعف اور انحطاط کی ہے۔ مگر چونکہ اس کا بیج اب بھی ہم میں موجود ہے، گو برگ و بار نہیں اس لیے یورپ چاہتا ہے کہ اس طرح کے انتشارات سے سہما اور ڈرا کر ہم کو آئندہ کی ہوشیاری اور بیداری سے بھی باز رکھے اور رہی سہی اتحادی قوت کا بھی اس کی نشو و نما سے پہلے خاتمہ کر دے۔

اے حضرات! یاد رکھیے کہ آج اسلام کے لیے مسلمانوں کی کوئی وطنی اور مقامی تحریک سود مند نہیں ہو سکتی اور اس کشتی کے تیرنے کے لیے اصلی دنیا کہ یورپ کے اختراعی پان اسلام

ازم کے سوا اور کوئی بادبان نہیں ہے۔ ایک قوم جو ریگستانِ عرب سے دیوارِ چین تک آباد ہے اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کا تغیر کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آ رہی ہیں خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زار ہند میں، میرے عقیدہ میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا ایک عمل السحر ہے۔ جو اس لیے سلا تب ہے کہ سودہ الوں کا اٹھنا اسے پسند نہیں۔ میں نے کہا کہ ہم میں سچا پان اسلام ازم یا بالفاظِ اصلی رشتہ، اخوت دینی باقی نہیں رہا۔ لیکن کیونکر باقی رہے جب کہ ہندوستان میں ایسے عظیم الشان اشتغال ہمارے لیے موجود ہیں جو نفسِ اسلام کے بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں ان کو چھوڑ کر ہم غریب ترکوں یا ایرانیوں کی کیونکر خبر لیں وسب سے مقدم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے۔ اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ یہ بات کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے جہاں خود اس اسلام کے بقا و فنا کا سوال درپیش ہے مگر اس کو کیا کیجیے کہ مسلم یونیورسٹی ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین کعبہ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مرادوآرزو، اور ہمارے رہنمائے اوّل کی دی ہوئی شریعت تعلیم کا یوم تکمیل ہے۔ جس دن یہ یونیورسٹی بن جائے گی، اُس دن ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔ کی وحی اسٹریچی ہال پر نازل ہوگی۔ ترکوں کی ہمدردی اور ایرانیوں کی مصیبت پر اداسے فریضہ تشکر کا ایک رزولیوشن پاس کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس پر ملامت نہ کیجیے کہ کم بخت طرابلس کے جھگڑے سے یونیورسٹی کے چندے میں فرق پڑ گیا۔

اے عزیزانِ ملت! قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے فرض کیجیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے پورے کر لیے اور اُن کا ہر فرد تعلیم اور دولت کا ایک مرکب طلائی بُت بن گیا۔ لیکن اگر سرے سے خود اسلام کی سیاسی طاقت ہی پر چھری چل گئی تو پھر علی گڑھ میں یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ چاندی اور سونے

کی بہشت شداد بھی بن جائے مگر اُس کے حور و غلمان کس کا ترانہ گائیں گے؟

اے اخوانِ عزیز! یاد رکھیے کہ دنیا میں امن صلح اور ترکِ قتل و غارت کا تصور کتنا ہی خوشنما ہو مگر دنیا کی بدقسمتی سے اب تک اصلی قوت تلوار کی قوت اور زندگی کا سرچشمہ آبِ حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں ہے۔ دنیا پر اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا ہے کہ تلوار کی صداقت ضعیف ہوئی ہو اور امید نہیں کہ آئندہ بھی کبھی ایسا زمانہ نصیب ہو۔ غریب اخلاق نے ہمیشہ اپنی تنگنائے بیکسی میں چھپ کر کسی ایسی دنیا کی منتیں مانی ہیں، جب کہ تمام کائناتِ انسانوں کی جگہ ملائکہ معصومین کی بہشت زار بن جائے گی اور قتل و خونریزی کو لوگ اسی طرح بھول جائیں گے جس طرح موجودہ عالم نے امن اور صلح کو فراموش کر دیا ہے۔ اس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل سے فریفتہ نہیں ہوگا لیکن کیا کیجیے کہ دنیا امید و آرزو کی نہیں بلکہ حقائق و نتائج کی جگہ ہے۔ اور انسان جب تک فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے اس وقت تک ایسی امیدوں کا اخلاق کے صفحوں سے باہر پتہ لگنا ممکن نہیں۔ آج اگر پوچھا جائے کہ قوموں کی زندگی اور زندگی کے مظاہر کہاں تلاش کیے جائیں تو اس کا جواب علم و فن کی بڑی بڑی درسگاہوں اور علوم الاولین والآخرین کے کتب خانوں سے نہیں ملے گا۔ بلکہ اُن آہن پوش جہازوں کے مہیب طول و عرض سے جن کی قطاریں ساحل کے طول میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے روزنوں سے انسان پوش توپوں کے دہانے نکلے ہوئے ہیں۔

پس حضرات! وہ ہاتھ نہایت مقدس ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو مگر زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں خوں چکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ یہی اقوام کی زندگی کا منبع بقا، عدل و میزان کا وسیلہ انسانی سبعیت و درندگی کا بچاؤ اور مظلوم کے ہاتھ میں اس کی حفاظت کی ایک ہی ڈھال ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ — اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ	کے ساتھ بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان
الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ	دی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں اور نیز
وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ	لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں
شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۝	سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی۔

مسلمان یاد رکھیں کہ آج صرف ایک ہی تلوار ہے جو دین الٰہی کی حمایت میں بلند ہو سکتی ہے اور وہ صرف آل عثمان کی مقدس شمشیر خلافت ہے۔ یہ اسلام کے گذشتہ قافلہ جہاں بانی کا آخری نقش قدم اور ہمارے آفتاب اقبال کی آخری شعاع امید ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا ترکوں سے رشتہ محض اخوت دینی ہی کا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی مقدم تر رشتہ خلافت اسلامیہ کے دینی احترام کا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی قوم بغیر کسی سیاسی مرکز کے زندہ نہیں رہ سکتی، اور اسلام کا کوئی مرکز سیاسی اگر ہے تو صرف خلافت آل عثمان ہے ہر مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو، اگر اس کا فرض دینی ہے کہ اسلام کی بقا کا خواستگار رہے، تو یہی فرض دینی ہے کہ خلافت آل عثمان کو ایک خاص دینی رشتہ کی طرح اپنے دل میں محفوظ رکھے اور دنیا کی جو حکومت اسکی دشمن ہو، اسکو اسلام کا دشمن اور جو اسکی دوست ہو اسکو اسلام کا دوست یقین کرے، کیونکہ مسلمان کی دوستی اور دشمنی انسانی اغراض کیلئے نہیں بلکہ صرف دین الٰہی کے لیے ہے۔

مسلمانان ہند کی نسبت بار بار سیاسی حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ وہ دنیا کے اسلامی حصے کے واقعات سے اس درجہ متاثر نہیں ہوتے جس درجہ ترکی کے حوادث و حالات سے۔ اگر محض رشتہ اخوت اور اشتراک مذہب ہی اس اثر پذیری کی علت ہے تو اس میں ترکوں کی خصوصیت کیا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس واقعی ضروری سوال کے جواب میں یا تو نفاق سے کام لینا چاہتے ہیں یا مکر سے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے بہتر راہ اسلام کی ہے۔ مسلمانوں کو بغیر ادنیٰ تامل کے صاف صاف اس سچے سوال کا سچا جواب دینا چاہیے۔

تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہمارا صرف ایک ہی رشتہ ہے، دینی اخوت اور پان اسلام ازم کا۔ مگر ترکوں سے ہمارے دو رشتے ہیں۔ پہلا اخوتِ دینی کا کہ وہ بھی مسلمان ہیں اس لیے خدا نے ہم کو ہمیشہ کے لیے اُن کے رنج و راحت کا شریک بنا دیا ہے۔ دوسرا اس سے بھی قوی تر رشتہ خلافتِ دینی اور اسلام کے آخری سیاسی مرکز ہونے کا، کہ آج کلمۂ اسلام کی حفاظت کی آخری تلوار صرف ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی اور حصّے سے اسلام کی حکومت مٹتی ہے تو ہم روتے ہیں کہ ہمارا ایک عضو کٹ گیا لیکن ترکوں پر جب کوئی آفت لائی جاتی ہے تو تڑپ جاتے ہیں کہ ہمارا اصل دو نیم ہو گیا۔ ہم جب ترکوں کے لیے مضطرب ہوتے ہیں تو ہمارا اضطراب مسلمانوں کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے لیے ہوتا ہے۔

حضرات! وہ قوم جس کا ظہور تیرہ سو برس ہوئے کہ عرب نامی ایک جزیرہ نما سے ہوا تھا، اور جو مسلم کے لقب سے پکاری جاتی ہے، اس کا عقیدہ تو یہی ہے جس کو میں نے بیان کیا۔ لیکن بدبختی سے ایک دوسری قوم بھی ہم میں موجود ہے جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی دنیوی عزت و شوکت کا جوا کھیلا ہے اور اس کے لیے ملتِ مظلوم کو ایک بازیچہ بنا لیا ہے۔ ہوائے نفس جن کا اِلٰہ ہے، حکام و امرا جن کے معبود ہیں۔ درہم و دینار جن کا قبلہ ہے۔ غلامی و تعبد جن کی شریعت ہے، جو قریشِ مکہ کے صامت و ساکن بتوں کی جگہ سمندر پار سے آئے ہوئے متحرک بتوں کو پوجتے ہیں، جو وحیِ الٰہی کی جگہ بالائے شملہ سے اترے ہوئے احکام و فرمان کو اپنی کتاب و سنت یقین کرتے ہیں اور جن کے قلوب اصابع الرحمٰن کی جگہ اصابع الشیطان میں ہیں۔

تو اے حضرات! اس قوم کے عقیدے میں پان اسلام ازم یا بین المللی اتحاد ایک کفرِ صریح ہے، خلافتِ اسلامی کوئی شے نہیں۔ مسلمانانِ ہند کو ترکوں سے کوئی تعلق نہیں، ان کو اپنی خلافتِ راشدہ کے سوا اور کسی طرف گوشۂ چشم سے بھی نہیں دیکھنا چاہیے، اگر ایسا کریں تو فرضِ اطاعت اولی الامر کی خلاف ورزی کے مجرم، ترکی فتح پر تبریک و تہنیت

کا نار دینا خفیف الحرکتی اور بغیر ان کے معبودانِ کورنمنٹ کی اجازت قطعاً حرام و معصیت یہ لوگ یورپ کے ان شیاطینِ سیاست کے ہاتھ میں خلافتِ اسلامیہ کے بین الملی اثر مٹانے کیلئے تیس برس سے اپنا حسن پھیلائے ہیں ایک آلۂ عمل رہے ہیں اور ہمیشہ دنیا کو اس کا یقین دلایا ہے کہ مسلمانانِ ہند کو خلافتِ اسلامی اور ترکوں کے بقاو فنا سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ جس وقت اپنے معبودانِ باطل کے آگے ان لوگوں کی زبان اور قلم سے یہ جملے نکل رہے تھے یقین کیجئے کہ اس وقت اللہ اور اس کے ملائکہ کی لعنت اور پھٹکار ان پر نازل ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس طرح بے تعلقی ظاہر کر کے یہ اس کا رشتہ کاٹ رہے تھے جس کو خدائے ابراہیم و محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام نے تمام دنیا کے مسلمانوں میں قائم کر دیا ہے۔ اور گویا اس پر اپنی رضا و مسرت ظاہر کرتے تھے کہ وہ لاکھوں مسلمان جو اس آخری وقت میں کلمۂ توحید کی حفاظت کر رہے ہیں صلیب پرستوں کی تلواروں سے فنا کر دیئے جائیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کی اذیت پر خوش تھے اور مسلمانوں کی اذیت پر خوش ہونا اللہ اور اس کے رسول کی اذیت پر خوش ہونا ہے۔

اب زمانہ نے پلٹا کھایا ہے زمین اور آسمان دونوں طرف سے تازیانہ ہائے عذاب ان پر پڑ رہے ہیں۔ اس لیے گو دل نہ ہلے ہوں مگر زبانیں کچھ ہلنے لگی ہیں۔ اب ترکوں سے اس قدر بے مہری ظاہر نہیں کی جاتی نہ خلافتِ اسلامی کا نام آتے ہی اس سے انکار و تبری کے تار "پائنیر" میں بھیجے جاتے۔ مدت سے کوئی پمفلٹ بھی مسئلۂ خلافت پر شائع نہیں کیا گیا ہے۔ ریڈ یو فنڈوں کے پاس کھونے سے بھی چند اں انکار نہیں ہے۔ بعض اصحاب کی تو بظاہر اس درجہ قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ کہ علانیہ ترک مجروحین کے لیے چندے میں بھی شرکت کر رہے ہیں۔ تاہم مجھ کو معلوم ہے کہ اس انقلاب کی اصلی علت کیا ہے اور ان کے ظاہر و باطن میں باہم کیا ربط ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ

یہ منافق جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے
ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن جب اپنے شیطانوں
کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دل

مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ سے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں ظاہری کا رروائیاں

جس قدر ہماری ہیں وہ ایک تمسخر دلگی سے زیادہ نہیں۔

اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ

اے اخوانِ ملت! آج وہ وقت آگیا ہے کہ دلوں پر سے پردے اٹھ جائیں اور کفر و ایمان میں تمیز ہو جائے یقین کیجیے کہ یہ ایک سب سے بڑی اور شاید آخری ابتلائے عظیم ہے جو صرف اس لیے ہے کہ اللہ مدعیانِ اسلام کو آزمانا چاہتا ہے۔ آج وہ دن آگیا ہے جب مسلمانوں کے دل پہلوؤں کی جگہ ان کے چہروں پر آجائیں گے جب کہ دلوں کی سیاہی سے ان کی پیشانیاں بھی تاریک ہو جائیں گی، یا دل کی ایمانی روشنی ان کی پیشانی پر چمکنے لگے گی۔

یاد رکھیے کہ خدا تعالیٰ اپنے کلمۂ توحید کی حفاظت کے لیے ہم مسلمانوں کی اعانت کا محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اس کے فضل کے محتاج ہیں اس تیرہ سو برس کے اندر اسلام میں کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں اسلام کی حفاظت کا فرض ادا کر گئیں۔ مگر اس آخری آزمائش میں بھی ہم پورے نہ اترے تو کیا عجب ہے کہ قدرتِ الٰہی اپنے دین مبین کی حفاظت کیلئے دوسروں کو چن لے اور ہم کو اسی طرح اپنے دروازے سے مطرود و مردود کر دے جس طرح ہم سے پہلے بہت سی قومیں ہو چکی ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ	اے لوگو! تم اللہ کے دروازے کے فقیر و سائل
اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔	ہو۔ اللہ تو تمہاری مدد سے بے نیاز ہے اگر وہ
اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ	چاہے تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور ایک دوسری مخلوق
جَدِیْدٍ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔	پیدا کر دے اور اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔

اللہ کے عجائب کار و بارِ قدرت کے یہ تماشے پہلے ہی دن سے ہیں کیا نہیں دیکھتے کہ اس نے مکہ کی سرزمین کو محبوب ہونے کا شرف عطا فرمایا اور قریشِ مکہ کو اپنے نورِ رسالت کا حامل بنایا۔ لیکن جب انہوں نے اس احسانِ الٰہی کی قدر نہ کی تو غیرتِ الٰہی نے کہا کہ اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے کچھ سرزمینِ مکہ ہی کا ہونا ضروری نہیں ہے دینِ حق کی اعانت کیلئے مدینہ والوں کو بھیج دیا۔

اے اخوانِ عزیز! میں جس چیز کے اعلان سے نہیں ڈرتا، تعجب ہے اگر آپ اُس کی سماعت سے خوف زدہ ہوں، میں کہتا ہوں کہ ہر اس مومن پر جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے کا فرض ہے کہ آج جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ سب سے پہلا جہاد اس کے لیے جہادِ مال ہے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو جہادِ نفس و جان ہے، مال و متاع کو بھیج دو اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار رکھو۔ آج اگر ضرورت پیش نہ آئی تو کیا مضائقہ ہے، کل کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ متاع ایسی نہیں جس کی تیاری بے کار جائے۔

مسلمانو! یاد رکھو کہ اوروں کی جانیں ان کے قبضوں میں ہوں گی مگر ہم مسلمانوں کی جانیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ اسلام ایک خرید و فروخت ہے جو ناقص کو لیتا ہے اور کامل کو دیتا ہے۔ فنا کو خریدتا ہے اور بقا اس کی قیمت دیتا ہے۔ ہم نے جس وقت اقرار کیا کہ ہم مسلم ہیں، اسی آن اس کا بھی اقرار کر لیا کہ ہماری جانیں اسلام کے ہاتھ بک گئیں۔ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ خدائے واحد کے آگے اپنی گردنوں کو جھکا دینا، پھر خواہ وہ اُسے دوستوں کی گود میں ڈال دے یا دشمنوں کی تیغ کے سپرد کر دے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ جب حضرت ابراہیم نے حکمِ الٰہی کے آگے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل کی گردن قربان ہونے کے لیے مستعد ہو گئی تو اس وقت فرمایا۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ	پس وہ جب دونوں مسلم ہوئے
لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ	اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے
قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا	بل زمین پر گرا دیا تاکہ ذبح کر دے

تو ہم نے پکارا، اے ابراہیم بس کر دو تم نے اپنا خواب پورا کر دکھایا۔

صوبائی مجلس خلافت ــــ آگرہ

۲۵ راکتوبر ــ سنہ ۱۹۲۱

خدا کی اس کائنات کے ایک ایک ذرہ کے اندر اِس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کیلئے ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمہارے لیے بدل دیگا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دیگا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اِس ٹھوکر میں پڑے رہے تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

حضرات! آپ کے صوبہ کی غالباً یہ تیسری مجلس خلافت ہے، جس کی صدارت کی خدمت کے لیے آپ نے از راہِ لطف و نوازش مجھ کو منتخب فرمایا ہے۔ میں اس لطف و عنایت کے لیے آپ تمام بزرگوں و عزیزوں کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں آپ تمام عزیزوں کی مساعدت میری مدد کرے گی اور اللہ تعالیٰ توفیق دے گا کہ اس کو بہتر امیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے جن بیانات کی ضرورت تھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ بیان میں آچکے ہیں، بار بار اُن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ بار بار جلسوں میں وہ پیش ہو چکے ہیں۔ زبانوں پر بھی بار بار ان کا اعادہ ہو چکا ہے۔ قلم نے بھی بار بار اُن کی تکرار کی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل کی نسبت اس وقت اور زیادہ تفصیل سے کام لینا بالکل غیر ضروری ہے۔

لیکن اگر اس امر کی ضرورت ہوتی کہ میں وقت کے مسئلوں کی نسبت، تحریکِ خلافت کی نسبت، آزادیٔ ہند کی تحریک کی نسبت آپ کی خدمت میں گزارشات کا کرنا ضروری محسوس کرتا جب بھی میں ایک ایسے شہر میں جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسی کہ اس شہر کی تاریخ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام بیانات کی جو انسان کی گویائی کر سکتی ہے کچھ ضرورت نہ تھی۔ آپ سمجھتے

ہیں کہ اس دنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف نقاب ہیں، اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی۔ اسی طرح سچائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں اور سچائی ہمیشہ ان مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت وبلاغت آپ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے کہ جس کا تعلق ہماری آپ کی خدا کی دی ہوئی گویائی سے ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے اور جس کے لیے زبان کو گویائی اور تکلم کی ضرورت ہے۔ لیکن اس دنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے، وہ گویائی کہ جس کے لیے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ جو کان سنیں، بلکہ جس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ آنکھیں اس کا مطالعہ کریں۔

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ حقیقتاً یہ اُس اٹھارہ مہینے کے گزرنے کے بعد جو آپ کی اس تحریک کے بعد گزر چکے ہیں، اگر ایک ایسی مجلس میں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے آگے ماتم اور فریاد کی جاوے، التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جائے، تمام حقائق ومعارف کا دفتر کھولا جاوے تو میرے عزیز خاص کر وہ جو شہر آگرہ کے باشندے ہیں، بلکہ جو ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے ہندوستان کے مدفن کے باشندے ہیں، اگر اب بھی ان کو ضرورت ہے خطبہ کی تقریروں کی تو وہ ان تقریروں کے لیے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔

آیئے ہم اور آپ چشم تصور سے کام لیں۔ اور چند منٹوں کے لیے اس جمنا کے کنارے پہنچیں، جس کو آج ہی میں نے علی گڑھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اس جمنا میں اتنا پانی بھی نہ پایا جتنا خون ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا بہہ چکا ہے۔ اگر وہاں آپ میری ہمراہی کریں گے تو میں آپ کے لیے ایک بہترین آواز کی زبان کو، ایک بہترین دفتر عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے وہاں ایک مجسمہ فصاحت موجود ہے، وہاں ایک مجسمہ خطبہ موجود ہے، وہ جمیلہ عمارت موجود ہے جو ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے

وہاں شاہجہان کا مدفن و آرام گاہ موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے کہ جو زبان تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس آبادی میں اس تہذیب کے مدفن اور عالم کے قربان گاہ میں میں کونسی چیز پیش کروں۔ اس زمین کے ایک ایک چپہ کی خاموشی میں آواز موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں، ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں جن کا غبار ہوا میں اڑ رہا ہے، نصیحت موجود ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے، البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے۔ جو آپ کے آگے اس لئے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سنائے بلکہ ماتم کرے۔ اور آپ سے اُمید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے، آپ کے مشاغلاتِ دنیا اجازت دیں تو آپ بھی اس کے ماتم میں شریک ہوں۔

اٹھارہ مہینے کا زمانہ گذر چکا، کہ ہم نے اس سفر کا اعلان کیا۔ اس اٹھارہ مہینے کے اندر تحریکِ خلافت کی کتنی منزلیں ہیں جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلۂ خلافت پر، مقاماتِ مقدسہ پر، ہندوستان کی آزادی پر (جو مسلمان کیلئے ویسا ہی فرض شرعی ہے جیسے تحفظِ خلافت) مناسب نہیں سمجھتا کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لئے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے۔ کہ جو آپ کے دلوں کو متینہ کر سکتی ہے۔ اس وقت اس جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ احتساب کی نظر ڈالیں۔ اور اس کا اندازہ کریں کہ اس اٹھارہ مہینوں کے اندر جو سفر درپیش آیا تھا اُس میں سے ہم نے کونسی منزلیں طے کیں اور آگے کونسی منزلیں باقی ہیں۔

اِس بارہ میں آپ کے صوبہ کو علاوہ تاریخی خصوصیت کے اور خصوصیت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو آپ ہی کا یہ صوبہ ہے جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عملِ عظیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کو آپ نان کوآپریشن کے نام سے سُن چکے ہیں۔ میرٹھ

میں جو خلافت کا جلسہ ہوا اس میں مہاتما گاندھی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسہ میں سب سے پہلے ترکِ موالات کو خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عمل اجتماع کے اعلان کیا گیا۔ آپ ہی کا صوبہ ہے کہ جس میں سب سے پہلے ہم نے اس سفر کے کوچ کا اعلان کیا۔ اٹھارہ مہینے گذر چکے۔ اٹھارہ مہینے کی مایوسیاں یہ سب گذر چکیں۔ اب ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ ہم نے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے۔ عجب نہیں کہ ہمارے سفر کے متعلق بہت سی کمزوریاں، شکوک شبہات جو ہم میں سے بعض کے دلوں کیلئے موجب خلش ہوا کرتے ہیں دور ہو جائیں۔ عجب نہیں کہ نظر ڈالنے کے بعد خود بخود ان کا ازالہ ہو جائے۔

اس پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانی چاہیے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد کیا تھا اور سعی قربانی کا جو میدان آپ کے سامنے پیش آیا تھا کیا تھا؟ اس میں ایک عالمگیر غلطی ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ محض چند قوموں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ نوعِ انسان کی غلطی ہے۔ انسان جب کسی کام کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو وہ اس میدان کو ڈھونڈتا ہے جو اس کے وجود سے باہر ہو۔ اور جو سب سے پہلا میدان اس کے سامنے ہے اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے ہم متعین کریں کہ مقصدِ خلافت کے لئے مدافعت کا جو میدان تھا وہ کونسا تھا۔ کیا وہ میدان وہ تھا جو ہندوستان کے رقبہ سے باہر ہے یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا۔ اس بارہ میں فی الحقیقت دو میدان تھے جو آپ کو پیش آئے تھے۔ پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کیلئے اولین قیام گاہ تھا۔ وہ میدان ہندوستان سے باہر کا میدان نہ تھا۔ وہ عراق، شام، ایشیائے کوچک اور سمرنا کا نہ تھا جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا، عزم کا، عمل کا تھا۔ اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دوں۔ وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپکے ملک کی فتح شکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے، دنیا کی کامیابی آپکا استقبال

نہ کر سکتی۔ آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے میدان کو استوار کرتے۔ اپنے پہلے میدان کا ہتھیار اور ساز و سامان سنوارا ہوتا۔ جب تک اسے فتح نہ کرتے دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔ تحریکِ خلافت کے لئے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا، خود مسلمانوں کا میدان تھا۔ ہندوستان میں بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔ سب سے پہلی منزل جو آپ کو پیش آئی وہ تھی جس میں آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ جس وقت بے چارگی کا یہ حال تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں جن پر خلافت کا نعرہ تھا، لیکن کوئی متفقہ میدانِ عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ مجالس کے مقصد سے یہ معاملہ آگے نہیں گذرا تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریکِ خلافت پر گذر چکی ہیں اس سے زیادہ اور کوئی قوت اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و توفیق فرمائی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ باوجود ہماری درماندگی دکھائے ترکِ عمل کے اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور ہم کو کامیابی عطا کی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر اور بہت سے میدانوں کو فتح کر لیا۔ جب دنیا کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ کسی محدود جماعت کی تحریک نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔ یہ پہلا میدان تھا جو تحریکِ خلافت کو پیش آیا اور اس کی کامیابی کے ساتھ اس تحریک نے فتح کیا۔

اس کے بعد دوسری منزل ہے جو اس تحریک کو پیش آئی۔ اس تحریک کی فتحمندی کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت کی تحریک نہ ہو بلکہ یہ اس ملک کے لئے ملکی تحریک ہو جائے۔ یہ دوسری منزل تھی جو تحریکِ خلافت کو پیش آئی۔ ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ دلوں کو گھر نہ بنائے بلکہ بتیس کروڑ دلوں کو اپنا گھر بنائے۔ یہ ہندو بھائی ہمارے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ اور ان کی ہمدردی بھی اس تحریک میں شامل ہو جائے۔ اسلئے نہیں کہ فی الحقیقت مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی

اس چیز پر موقوف تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو اس مدد کی زحمت دیتے بلکہ ہم میں سے ہر شخص جس کے دل میں ایمان موجود ہے اُس کو یہ یقین ہونا چاہئے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے ، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔

اس سے پہلے بار بار میں اعلان کر چکا ہوں اور آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ درحقیقت اس مقصد کی کامیابی کے لئے ہندوستان کے کسی رقبہ میں کسی ایک بھائی کو ہم اس امر کی زحمت دینے کے لئے مجبور نہ تھے کہ وہ ہم کو مدد دیتا - اگر مسلمان کامیابی حاصل کر سکتے تھے تو اللہ پر اعتماد کر کے ، اللہ کی نصرت پر ، اپنے ایمان پر اعتماد کر کے - لیکن بلاشبہ جبکہ مسئلہ کی صورت کا یہ حال تھا تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک خلافت کے ضمن میں خود ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا جس وقت تک ملک میں کوئی عام تحریک پیدا نہ ہوتی اور فی الحقیقت تحریکِ خلافت کی کامیابی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقت ور ہنگامے کیساتھ کل ہندوستان کے مسئلہ کو زندہ کر دیا کہ جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہ ملا تھا۔

اس کامیابی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف تحریکِ خلافت ہی موجود نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا مسئلہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے اس مسئلہ کی کامیابی کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ کی تحریک نہ ہوتی بلکہ اس کے ضمن میں عام ہندوستان کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اُٹھتی اور عام مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

اگر آپ کے دل مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اُمید دلاؤں کہ مسئلہ خلافت کی دوسری منزل ہے ، جس میں ہم نے کامیابی حاصل کی ہے میں اس منظر رفاقت کو ایک منٹ کے لئے فراموش نہیں کر سکتا کہ جونہی مسئلہ خلافت ہندوستان میں چھیڑا گیا ، ہندوستان کے تمام گوشوں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے کامل صداقت کے ساتھ

تحریکِ خلافت کا استقبال کیا اور اپنی تمامتر ہمدردیاں اُس کے لئے وقف کر دیں۔

لیکن جہاں تک اس کا تعلق ایک ملکی مسئلہ سے ہے، وہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کے محرک چند رفقاء تھے۔ میں نام لوں گا مہاتما گاندھی جی کا کہ وہ اس تحریک کے اوّلین اور سب سے بڑے قابلِ عزت بزرگ تھے کہ جنہوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ مگر اُس وقت تک اس مسئلہ نے تمام ہندوستان کے قومی مسئلہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریکِ خلافت میں یہ معاملہ مسلمان کے لئے ضروری تھا۔ تحریکِ خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کر دیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی تیسری فتح مندی تھی جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے صداقت و حق پرستی کے بہترین اور اعلےٰ فرض ادا کرنے کے لئے، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یک جہتی ضروری ہے۔ میرا قصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اس مسئلہ کے متعلق کہوں کیونکہ الحمدللہ یہ مسئلہ عمل تک پہنچ چکا ہے اب اس امر کی ضرورت نہیں کہ اس پر بحث کی جائے۔ لیکن چونکہ تحریکِ خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں گے کہ میں کچھ اس کے متعلق کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندوستان کی نجات کے لئے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے لیکن یہ مسئلہ آج تحریکِ خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے بلکہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود تھے کہ تحریکِ خلافت کی بنا پر نہیں بلکہ چونکہ انہوں نے اپنی ہدائیت کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہدایت کا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا، اس لئے اسلام کے اصولوں نے، اسلامی تعلیم نے اُن کو مجبور کیا تھا کہ اس کا ہندوستان میں اعلان کریں۔ تحریکِ خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی

فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے انہیں انجام دینا چاہیئے۔ یہ بھی ایک سچی حیثیت ہے۔ مگر سب سے پہلی حیثیت جو ہے وہ یہ ہے کہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔

میں اپنے سینہ میں وہ دل رکھتا ہوں جس کے لیئے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں جو فاطر السموات نے نہ بھیجی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔ مگر یہ اعتقاد قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو اگر ایک طرف ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے۔

ترک موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں۔ موالات ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں محبت، اعانت، نصرت کے تو ترک موالات کے معنی ہوئے مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کرلینا جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے اس حکم کی بنا پر قرآن مجید نے دنیا کی تمام قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ چنانچہ اسکی تقسیم سورۂ ممتحنہ میں کر دی ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں پیش ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں۔ مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں کہ نہ تو جنھوں نے حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی قوموں کیلئے ایک لحہ کیلئے قرآن مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ وہ مصالحت نہ کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں مسلمانوں کو انکی بستیوں سے نکالیں۔ ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلاشبہ

قرآنِ مجید کی تعلیم یہ ہے کہ انکے ساتھ تعلقات منقطع کر لیئے جائیں اور قرآن مجید کا یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر ہے جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے اس ہمہ گیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآنِ مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی ایسا تعلق جو محبت، دوستی، صلح وفاداری کا ہو اور ہر طرح کی اعانت و نصرت کا ہو نہیں رکھ سکتا۔

لیکن یہ حکم قطعی جو متعدد آیاتِ قرآنی میں موجود ہے اور سورۂ ممتحنہ میں بھی موجود ہے جس میں فرمایا ہے۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ	اللہ تعالیٰ ایک منٹ کیلئے اس بات
لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ	سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے نہ تو
یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ	تم سے لڑائی لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے
تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ	نہ مسلمانوں کو اُن کی آبادیوں سے نکالا ہے
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝	ایسے غیر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد اور ہر طرح

کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتا ہے نہ کیا جائے۔

قرآن دنیا میں دشمنی کا پیغام نہیں لایا ہے، وہ تو محبت کا پیام لایا ہے، اس لیئے محبت کے قائم رکھنے کے لیئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ٹھیک اسی قانون کے مطابق کہ جس کے مطابق عدالت مجرم کو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کرتی ہے عمل کیا جائے۔ جو لوگ خدا کی حریت کو توڑنے والے ہیں ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی تعلق محبت اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتا۔

اس تقسیم کی رو سے جہاں آپ کے سامنے ترکِ موالات کا مسئلہ آگیا کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر وہ واقعات ظہور پذیر ہو گئے ہیں کہ جن کے بعد برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں فریقِ محارب ہو گئی ہے۔ یعنی لڑنے والی فریق ہے۔ میں نے محارب کے نعدیلہ

بہت سے لوگ یہاں محارب اور غیر محارب پر زور نہ دیتے میں نے غیر محارب اور محارب پر زور دیا۔ برٹش گورنمنٹ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں از روئے شریعت فریق محارب ہو گئی۔ اس لئے اس نص قطعی اور بموجب گیارہ سے زیادہ آیتوں اور مذہب اسلام کے قانون کے مسلمانوں کیلئے یہ حرام اور ناجائز ہو گیا ہے فسق ہو گیا اور نفاق ہو گیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ قریب قریب کفر ہو گیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت واعانت، وفاداری واطاعت کا کوئی تعلق رکھیں اور اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لیئے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں اور ایسی حالتوں میں محارب قوم کے ساتھ رشتہ موالات رکھے گا، اگرچہ وہ زمین میں اپنے آپ کو مسلمان کہے لیکن اللہ کے نزدیک اُس کا شمار مومنوں میں نہ ہوگا، کفار میں ہوگا۔

آج بھی میں اعلان کرتا ہوں، اس لیئے کہ صلح کی خبریں اُڑ رہی ہیں۔ ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہو جانا چاہیئے کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے معاملات شرعی کو پورا نہ کرے۔ عراق کی سرزمین اُس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا نہ لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے۔ اُس وقت تک برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق محارب ہے۔ جس وقت تک مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ تمہارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے جنگلوں میں چلا جائے وہاں سانپوں اور بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا لیکن ہاں جس آن اور جس لمحہ حالات میں تبدیلی ہو جائے، حالات پلٹ جائیں۔ وہ فریق محارب نہ رہے بلکہ اس کے حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو جن لوگوں نے مسلمانوں

سے قتال نہیں کیا ہے، اُن کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، اِن کو دیس نکالا نہیں کیا ہے اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو، بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ اُبھارا ہو۔ جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہی تبدیلی آجائے گی۔ دھوکہ کی نہیں جس میں چالیس سال سے ہندوستان اُلجھا ہوا ہے۔ بمجرد حالات کی تبدیلی کے حکم بدل جائے گا۔ اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہوگا کہ صلح اور اتفاق کا ہاتھ بڑھائے۔ لیکن جس وقت تک گورنمنٹ فریق محارب ہے، وہ خلافت کے معاملات پورا نہیں کرتی، جب تک ہندوستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی۔ یعنی کوئی ٹھٹھ اور کسی قدر ترقی یافتہ ریفارم اسکیم نہیں بلکہ سوراج۔ جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی۔ اُس وقت تک مسلمانوں کیلئے اس کا وجود، اس کے ایجنٹوں کا وجود اس کے گورنروں کا وجود اس کی عدالتوں کا وجود اسی طرح ظلم وستم کی حقیقی کاروائیاں ہیں ان کا وجود، لڑنے والوں کا وجود ہے۔ مسلمانوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر لے کر دودھ پلائیں مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے ساتھ صلح کریں۔

لیکن جیسا میں نے عرض کیا یہ ایک ضمنی حقیقت تھی۔ اصل مسئلہ جس پر میں کام فرمائی کر رہا تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے ہندوستان کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لئے میں نے یاد دلایا تھا کہ میرا عقیدہ یہ رہا ہے۔ ۱۹۱۲ء جس کی جولائی میں پہلا نمبر الہلال شائع ہوا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہوں گے جنہوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔

۱۹۱۲ء کی جولائی میں پہلا نمبر جو نکلا، اس میں ایک بڑا نمایاں مقصد کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رُو سے مسلمانوں کے لئے اگر کوئی فریق ہو سکتا ہے جو نہ صرف ایشیاء کو مشرق کو، بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کی سچائی کو جو قوت آج چیلنج دے رہی ہے،

جو اُس کو مٹانا چاہتی ہے، جس کے غرور سے اللہ کی اس عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ برٹش گورنمنٹ کے سوائے کوئی دوسری قوت نہیں ہے اسلیئے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر جو انہوں نے اہل مدینہ اور بُت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود جناب سرور کائناتؐ نے عملاً پیش کیا ہے اور علماً و حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر کوشاں ہوں۔

میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا بجنسہٖ یہ اُس کے الفاظ ہیں۔ "اِنَّہُمْ اُمَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ"

"ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں، ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔"

"امت" کے معنی ہیں نیشن، قوم۔ اور "واحد" کے معنی ہیں ایک۔ اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اس وقت انجام دیں گے جب ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے۔ تو یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول نے اس وقت لکھوایا تھا کہ ہم سب مل کر بمقابل قریش کے ایک نیشن ہو جائیں گے جن مقاصد کی بنا پر جناب سرور کائناتؐ نے یہ عہد کیا تھا اُس سے زیادہ وجوہات آج آپ کیلئے موجود ہیں۔ اگر اس وقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی جو اسلام کو غربت میں دھمکی دے رہی تھی،

تو آج اس غربت ثانیہ میں مٹھی بھر قریش نہیں، بلکہ کرۂ ارضی کی دو تہائی بسنے والی قومیں اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں۔ اگر مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلہ میں، ابو سفیان کے مقابلہ میں، اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے۔ تو آج اس عظیم الشان قوت کے سے کمزور گھمنڈ، خود غرضی کے مقابلہ میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں؟

میں سب کچھ کہنے سے مجبور ہوں۔ کیونکہ یہ ایک نہایت ضروری پہلو ہے۔ بعد میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اگر ایک دو منٹ ان بحثوں کے الجھاؤ میں صرف ہو جائیں۔ اگر میں اس موقعہ پر اس جلسہ میں جس میں خوش قسمتی سے صاحب علم بھی تشریف فرما ہیں اور جن کی موجودگی میرے لیے موجب تقویت ہے، میں ان اہل علم کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر کسی بزرگ کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو جائے کہ سورۂ ممتحنہ کی تقسیم منسوخ ہے، اُن کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ یہ آیت منجملہ اُن آیات کے شمار کی جاتی ہے کہ جن کو آیت سیف نے منسوخ کر دیا۔ ممکن ہے کہ ان کے دل میں یہ خلش پیدا ہو کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے تو پھر اس سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ میں بلا اس طرف اشارہ کئے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ معاملہ نازک ہے۔ ضرورت ہے چشم بصیرت کی بعض اوراق گردانی کافی نہ ہوگی میں سب سے پہلے ان کو یاد دلاؤں گا کہ ایک نسخ اصولیوں کا ہے اور ایک نسخ قدماء کا ہے۔ اصولیوں نے جو محدود تعریف کر دی ہے نسخ کی۔ وہ نسخ کے اسلاف ان صورتوں میں نہیں کرتے۔ ہر وہ حکم کہ جس کا صرف تعلق اور عموم پر اثر پڑے، قدماء اور خلف صدرِ اوّل کی اصطلاح میں استدلال نسخ کہا جاتا تھا۔

بلا شبہ اس آیت کا حکم منسوخ ہوا مگر کن معنوں میں ہوا۔ یہ حکم منسوخ ہو گیا مگر صرف جزیرۃ العرب کے لیے، مشرکین عرب کیلئے۔ ان منسوخات کیلئے نہیں کہ جو تمام دنیا کی مشرک اقوام کے لیے ہے، بلکہ یہ اُن مخصوص احکام میں ہے کہ جو مخصوص ہو گیا ہے عرب کے

لئے۔ امام شافعی اس طرف گئے کہ جزیرۃ العرب کے علاوہ اور تمام دُنیا میں جتنی قومیں موجود ہیں اُن سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا مگر جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے لیئے ہے اور دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ مسلمان صلح کر سکتے ہیں اگر وہ اسکے مستحق ہیں۔ جن مفسرین نے محض لفظِ نسخ دیکھ کر اس کو منسوخات میں شمار کیا ہے اگر اس کے وہ معنی پیش کر لئے جائیں گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پانچ سو سے زیادہ آیات ہیں جو آیۂ منسوخہ سے منسوخ کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ ایک لمحہ کے لئے یہ سمجھنا کہ یہ حکم آئندہ کے لئے منسوخ ہو چکا ہے، یہ ایسا کلمہ ہے کہ جس سے بڑھ کر احکام شرع کے جہل کا اور کوئی کلمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ حقیقتِ شرعی ہے کہ جس نے یہ حقیقت ہمارے آگے بے نقاب کی تھی۔ اگر اس میں ایک طرف اسلام کے فریقِ محارب کے مقابلہ میں ترکِ موالات بتایا گیا تو دوسری طرف یہ حقیقت کھول دی کہ جن قوموں نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا ہے انکی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، اس کے لئے اللہ کی وہ شریعت جو دنیا میں ایک عالمگیر برادری کا اور محبت کا سبق دے اور اس تمام کرّہ ارضی کو خدا کی محبت کا ایک گھرانہ بنانے کیلئے آئی ہے، محالِ قطعی ہے کہ وہ ایک منٹ کے لیئے حکم دے کہ مسلمان دنیا کی کسی قوم کے ساتھ محبت اور عہدِ اتفاق نہ کریں۔

یہ حکم جزیرۃ العرب کیلئے تھا، وہاں کے متعلق خدا کی مصلحتیں تھیں کہ اس ٹکڑے کو مسلمانوں کا مرکز بنانے کے لیئے خاص کر دیا جائے اور وہ مسلمانوں کیلئے ایسا گھر ہو کہ اگر دنیا کے تمام حصوں میں ان کی جڑ ٹوٹ جائے تو یہ جڑ باقی رہے کہ ہمیشہ ابھر سکے اس لئے ضرورت تھی کہ جزیرۃ العرب کو مسلمانوں کے لیئے خاص کر دیا جاتا۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ آیت تمام دنیا کے لئے اور دنیا کی تمام قوموں کے لیئے منسوخ ہو چکی ہے۔

بہر حال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کیلئے میں آپکے سامنے یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ، یکجہتی کا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف

بڑھایا ہے تو یہ اُن کا عمل محض وقتی اور دفاعی نہیں ہے، پولیٹکل چال نہیں ہے۔ بلکہ ان کو یقین کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ اُن کے خدا نے اُن کے قوانینِ شریعت نے بڑھوایا ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد شریعت پر ہے اس لئے عزیزانِ من یہ سب کچھ ترکِ موالات کے مسئلہ میں نہیں، بلکہ بیس سال پیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا۔

دوستو! میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں تو وہ یہی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ میں ہندوستان کے اُن انسانوں میں ہوں جنہوں نے انسانوں کو کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے میں اپنے لئے کوئی ناچیز خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے جب مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھے۔ علی گڈھ کی مسلمہ قومی پالیسی یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے الگ رہیں، تو میں نے دعوت دی تھی کہ اگر ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے تمام عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو انکا فرض ہونا چاہیئے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا اُن کے مذہبی عمل میں سے تھا۔

بہر حال موضوع بحث یہ تھا کہ تحریکِ خلافت نے اندرونی میدان میں دوسری صورت میں کامیابی حاصل کی ہے تو یہ ہے کہ تحریکِ خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ اس قوت سے جاگ اُٹھا کہ آج اس کا ولولہ دنیا میں بلند ہے۔ اب تیسری منزل فی الحقیقت فیصلہ کن منزل ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ تحریکِ خلافت نے ہندوستان کی آزادی، پنجاب کے مسئلہ کو جس طرح زندہ کر دیا تھا، اس کے لئے کوئی مذہبی شاہراہِ عمل ہوتی اور آپکے سامنے کھولی جاتی۔ خلافت کمیٹی نے احکامِ شرع کے ماتحت اس امر کا فیصلہ کیا کہ ترکِ موالات مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن بدبختی سے جہاں مسلمانوں نے اپنے تمام مسائل کو ترک کر دیا ہے یہ مسئلہ بھی سہو کر دیا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کو زندہ کیا جاوے۔ خلافت کمیٹی نے اس امر کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے ترکِ موالات کا اعلان کلکتہ کے اس

جلسۂ خلافت میں ہوا جو فروری سنہ ۲۰ء کو ٹاؤن ہال میں ہوا تھا اور سب سے پہلے اس کی تحریک میری ہی تقریر میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ اس مسئلہ کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کر سکتے ہیں؟ اس سب کمیٹی نے بھی جس میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور میں تھا یہ طے پایا تھا۔ میں نے کہا نہ بحث کی ضرورت ہے اور نہ کچھ اور۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے آ رہی ہے پہلے تیرہ سو سال سے موجود ہے۔ اس کے بعد میرٹھ میں اس صوبہ کا پہلا جلسہ ہوا۔ اور اس میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے مختلف اجزا کو پیش کیا اور جو لوگ وہاں موجود تھے اور وہ تصدیق کرینگے کہ جو وہاں میں نے اعلان کیا تھا یہی تھا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی ہی اپیل ہے بلکہ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے۔ اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس وقت اس مسئلہ کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی اور تمام اراکین شریک تھے، مسلمانوں کے علماء کی تمام جماعت شریک تھی۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ بلاشبہ چونکہ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا اسلئے ہندوستان کی جو سب سے بڑی جماعت تھی یعنی انڈین نیشنل کانگرس، اس نے اس میں شرکت نہیں کی۔ میں آپ کو یاد دلاؤں گا اللہ تعالیٰ کے اس کرم کو کہ یہ تیسری منزل بھی سامنے آئی اور تحریکِ خلافت نے نہایت کامیابی سے اس کو فتح کیا۔ ایک معرکہ وہ تھا جو کلکتہ میں گرم ہوا۔ دوسرا وہ جو ناگپور میں گرم ہوا۔ پہلے دوسرے معرکہ میں ہزارہا ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے متفقہ آواز میں جس میں ایک آواز بھی خلاف نہ تھی، ترکِ موالات کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور یہ تیسری فتحمندی مسئلۂ خلافت کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔ یہ تیسرا میدان جس کو آپ ڈھونڈ رہے تھے وہ بھی اسی ہندوستان کے اندر موجود تھا جب تک آپکے اندر خود آپ کی قومی قوت واپس نہ آجاتی، جب تک آپ خود اپنے دلوں کے معاملات صاف نہ کر لیتے، جب تک آپکے دلوں میں عمل کی سچی روح پیدا نہ ہو جاتی اس وقت تک آپ

دشمنوں کے مقابلہ میں کیا کامیابی حاصل کر سکتے تھے

اصل میدان ہندوستان کا میدان تھا، اندرونی میدان تھا۔ اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا تھا، اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان، ترک موالات کے میدان میں بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دنیا کی کونسی قوت ہے جو آپ کو شکست دے سکتی۔ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں، ہمالیہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کریں وہ ایک منٹ کے لئے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کریں۔ ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو، قربانیوں کے میدان اور ملک کے اتفاق کے میدان کو فتح کریں۔ جب تک ہم ان میدانوں کو فتح نہ کر لیتے دشمنوں کے مقابلہ میں کیسے بازی جیت سکتے تھے۔

دنیا میں ہر فکر اور عمل کے لئے دو ہی موجب ہیں۔ ایک موجب امید کا اور ایک یاس و ناامیدی۔ اگر امید کی روشنی کو سامنے لائیں تو اس میں شبہ نہیں کہ تحریک خلافت نے ان تمام درماندگیوں کو دیکھتے ہوئے اندرونی میدان کی ان تین منزلوں کو اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی جماعت میں جس سے بڑھ کر ہندوستان کے لیے کوئی ملکی جماعت نہیں ہو سکتی، یعنی انڈین نیشنل کانگریس۔ اس کے اندر بھی اس نے کامیابی حاصل کی۔ یہ اٹھارہ مہینے جو گذر چکے ہیں، تحریک خلافت کی کامیابیوں کا زمانہ ہے، شکست کا نہیں۔ لیکن اگر اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے اندر گھمنڈ پیدا ہو جائے اور آئندہ عمل کی قوت جاتی رہے تو پھر یہ کامیابی آپ کے لیے فتحمندی نہیں بلکہ ایک کھیل ہے جسکو ہوا کا ایک طمانچہ اڑا لے جائیگا۔

اس کامیابی کا دارومدار آخری منزل پر موقوف ہے۔ جب تک آپ اس کو طے نہ کرینگے پہلی کامیابی آپ کیلئے سودمند نہیں ہو سکتی ایک موجب اُمید کا ہے اسکی روشنی میں آپنے

گزشتہ حالات پر نظر ڈالی۔ آپ نے دیکھا کہ بلاشبہ تحریکِ خلافت کی کامیابی کی بیل بڑھی۔

ایک دوسرا موجب بھی ہے، وہ نااُمیدی اور خوف کا ہے۔ ایمان دو پیروں سے اڑتا ہے۔ ایک امید کا دوسرا خوف کا۔ یہ ہماری بڑی ناکامیابی ہوگی کہ گذشتہ کامیابیوں کا تصور کرتے ہوئے آنے والی کامیابی کو بھول جائیں۔ بلاشبہ تحریکِ خلافت نے یہ کامیابی حاصل کی، لیکن ان تمام کامیابیوں کیلئے فیصلہ کن منزل وہ ہے جو تمہارے غفلت سے بھرے ہوئے سروں سے گزر رہی ہے۔ ان گھڑیوں کے اندر ہندوستان کا ہر شعلہ مسلمان، ہندو، پارسی اور عیسائی، ہندوستان کا ہر بسنے والا اور وہ انسان کہ جس نے گنگا اور جمنا کی صاف روانی دیکھی ہے اور ہندوستان کے تاروں بھرے آسمان کو سر پر اٹھائے ہے، ہر ایک کا فرض ہے کہ آنے والی کامیابی کو حاصل کرے۔ اگر اب بھی تمہارے ایمان کے شعلے نہ بھڑکے تو ان گزشتہ کامیابیوں کا افسانہ ایک منٹ کیلئے منزلِ مقصود تک تم کو نہ پہنچا سکے گا۔

اب آخری منزل آگئی کہ آج یا تو ہمیشہ کے لیے اُمید کا فیصلہ کرو گے یا ہمیشہ کیلئے نا امیدی کے مدفن میں اس تحریک کو دفن کر دو گے۔ وہ آخری فیصلہ کن گھڑی آپکے سامنے آگئی ہے۔ وہ کونسی ہے؟ افسوس کہ وقت کوتاہی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ آجائے کہ کونسی منزل ان کا انتظار کر رہی ہے۔ جب تک یہ پوری صداقت کے ساتھ اس کا دھیان اپنے سامنے نہ لائیں گے، گذشتہ کامیابیاں سودمند نہیں ہو سکتیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس منزل کا نقشہ کن لفظوں میں آپکی آنکھوں کے آگے سنواروں۔

میں دنیا کی تمام قوموں سے قطع نظر کر لیتا ہوں اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ جبکہ وہ دنیا کی طرح طرح کے اعلانات کی پرستش کر رہے ہیں اُن کو یاد کرنا چاہئے کہ انکے پاس ایک الہامی اعلان ہے۔ جب تک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائیں گے انکی کامیابیاں سودمند نہیں ہو سکتیں۔ وہ وہ ہے جس کا اعلان قرآن مجید نے جابجا کیا ہے۔ وہ ایک

مختصر سبق ہے کہ جس کو دہراتے ہوئے میں خاص طور پر اپنے مسلمان بھائیوں سے خطاب کروں گا اور ہندو بھائیوں سے التجا کروں گا کہ وہ خاص اصطلاح سن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈیں کہ خدا کی سچائی ایک ہے اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما، خدا کا کوئی ذرہ اس آسمان کے نیچے کامیابی نہیں پا سکتا جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے جو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اگرچہ قرآن نے اس بارہ میں نہایت تفصیلی بیانات دیے ہیں لیکن ایک نہایت چھوٹا بیان بھی ہے کہ جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے جن کا نام امام شافعی ہے یہ کہا تھا کہ اگر قرآن کے یہ چند جملے نازل ہو جاتے تو تمام کرۂ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

تحریکِ خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے، مراد چاہتا ہے۔ آپ مقصد اور مراد کے ڈھونڈنے والے ہیں آپ مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں، تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کیلئے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوعِ انسان کے لیے انسانوں کی تلاشوں کے لیے جستجوؤں کے لیے اور امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں، بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے کہ جو بچ سکتی ہے اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے وہ کون انسان ہیں؛ وہ انسان کہ جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً و عملاً اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوں گی اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ ملک۔ حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والے پرندے بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتے۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجاتے تو کیا تم انکار کر دوگے، چاہے وہ سچائی ہوئی ہو۔ پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآنِ مجید کی بولی میں ایمان ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو۔ جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر وہ چیز پیدا ہو جائے کہ جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔

ایمان کے معنی ہیں عربی میں زوالِ شک ہو۔ یعنی کامل درجہ کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو۔ اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر جس وقت تک کامل درجہ کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا۔ کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے۔ تو تم کو اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر ایمان، اطمینان، یقین، جماؤ، تمکین اور اقرار پیدا ہو۔ لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، تصور کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں۔

فرمایا ایک دوسری منزل اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لوگے اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس کا نام قرآن کی بولی میں عملِ صالح ہے (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی وہ کام جو اچھائی کے ساتھ کیا جائے۔ جس کام کو جس صحت اور جس طریقہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہو سکتا ہے، اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار کہ جو عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت یہاں ایک چٹیل میدان تھا۔ کوئی وجود اس شامیانہ کا نہ تھا۔ تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان نے اس وقت یہ شامیانہ نصب

نہیں کیا تھا لیکن اس وقت بھی یہ شامیانہ معہ ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے موجود تھا۔ کہاں؟ اُن کے دماغ میں۔ وہ چیز جو اُن کے دماغ میں موجود تھی، وہ ارادہ جو ان کے دماغ میں پیدا ہوا تھا وہ پہلی منزل ہوئی جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے بالکل جیسے وہ عملِ دماغ ہے، وہ عملِ تصدیق یقین ہے، اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو، دوسری منزل یہ ہے، عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ - صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ ٹھہر جائیں بلکہ عمل بھی کرو اور وہ جو صالح ہو، یعنی جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا۔ جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے کامیابی کے ساتھ طے کر لیں۔ مگر پھر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت کہتی ہے، کہ نہیں بلکہ دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور ابھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت تو آزما لو کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں، تمہاری کمرِ ہمت مضبوط ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے یہ دو منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں جو قرآنِ مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عملِ صالح ان کے اندر پیدا ہوں۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کرنے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ تم کیا ہو؟ اس بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو۔ اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں ہے بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے اُس کا کام پورا نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل ان فصیح و بلیغ معنوں میں ہے کہ۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ تیسری منزل ہے تواصوا بالحق کہ

تم جو ایک کڑی تھے، جس کو تم نے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کی طرف توجہ کرو۔ اس کو یوں درست کر سکتے ہو۔ کہ دنیا میں خدا کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے، جب تک تواصی حق نہ کرو گے کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔ لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے۔ اگر توفیقِ الٰہی نے تمہاری دستگیری کی تو پھر آخری منزل کون ہے، وہ یہ ہے کہ جو صبر کی منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کریں گے، چنانچہ حق کا وہ پیغام سنائیں گے۔ حق کی دعوت پہنچائیں گے حق کا یہ حال ہے کہ حق کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک قربانیوں کے لیے قدم نہ اٹھائیں۔ فرمایا کہ صرف حق ہی کا پیام وہ نہ پہنچائے بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کی بولیوں کو بھی بدل ڈالا۔ صبر کے معنی کیا ہیں! تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے عزتی اور باطل کی پرستش پر بچا۔ جو شخص صبر کے معنی یہ سمجھتا ہے اس سے بڑھ کر قرآنِ مجید کی تحریفِ لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔ تحریف معنوی تو بہت سے علماء کر رہے ہیں۔ لیکن تحریفِ لفظی یہ ہے اگر صبر کے معنی ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلہ میں مصیبت آجائے تو تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشہ میں پناہ لو۔ یعنی ہر طرح کی بے عزتی کو، بیچارگی کو، باطل پرستی کو قبول کر لو۔ صبر کے معنی بالکل اس سے مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے۔ صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے، صبر کے معنی ہیں تحمل کے جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب و پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں طرح طرح کی ڈراونی صورتیں آئیں، زنجیر اور ہتھکڑیاں آئیں مگر ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ ادے اور اس پر ایک پھندا لٹکے، یہ سب تمہارے

سامنے آئے گا لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو تو تمہارا فرض ہونا چاہیئے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت ہو، وہ پہاڑ برداشت کا تمہارے اندر موجود ہو کہ دنیا کی کوئی مشکل، کوئی تاج و تخت اس پر فتحیاب نہ ہو سکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں، چنانچہ قرآنِ مجید کے مواقعِ استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآنِ مجید نے جو صداقت نوعِ انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے اور اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے، یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے تو اس کی چار منزلیں ہیں ہم کو ایک منٹ کے لیے غور کرنا چاہیئے کہ کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے کیا تم ترک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول بھی پا سکتے ہو؟ جب تک تمہارے اندر طلب کے لیے حق نہ ہو۔ کیا ایک لمحہ کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے، جب تک تم حق کی راہ میں قربانیاں چڑھانے کے لیے تیار نہ ہو۔ خدا کی اس کائنات کے ایک ایک ذرہ کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے۔ اور اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لیے ہے کیا خدا اپنا قانون تمہارے لیے بدل دے گا؟ کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

میرے دوستو! آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی گذشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں۔ بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے اور اپنے دل سے

پوچھے کہ کیا واقعی اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن ہو گیا، کیا واقعی اس کے اندر عملِ صالح پیدا ہو گیا؟ کیا واقعی اس کے اندر حق پیدا ہو گیا؟ اب اس پروگرام میں آخری منزل قربانی کی ہے اگر اس کے لیے تیار ہو۔ تو اللہ کی کامیابی تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔ اگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے، اگر ہمارے دل کے اندر حق کا یہ پہلا احساس نہیں پیدا ہوا ہے۔ تو جو کچھ کہ ہم کر رہے ہیں اگر یہ سچ ہے تو ضرور ہے کہ کامیابی نہ ہو اور دنیا کی ساری طاقتوں کو اس کے مقابل میں فتح ہو، اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں۔ تو پھر کونسی شب ہے جو تمہاری چوکھٹ پر آئے گی اور تمہاری کنڈی کھٹکھٹائے گی۔ اگر اب بھی تم ایمان، توصیِ حق، عملِ صالح اور قربانی کے لیے تیار نہیں ہو، تو تم کو حق نہیں ہے کہ تم خدا کی زمین میں کامیابی کو ڈھونڈو۔

میں اب یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہ جو میں نے کہا، یہ وہ شرائط ہیں کہ جن کو نہ اول کہا جا سکتا ہے نہ آخر، جب تک یہ چار چیزیں ہمارے اندر پیدا نہ ہوں گی یہی چار چیزیں تھیں، جو ہماری تمام کامیابیوں کے لیے علت تھیں، جن کو تمام کرۂ ارضی میں دشمن پامال کرتے کرتے نہ کر سکے۔ جس طرح یہ شرائط اسلامی آپ کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح آپ کو خبردار ہونا چاہیے کہ جو آپ نے عمل ترکِ موالات کا شروع کیا تھا، اس کے متعلق جو منزلیں سامنے آئی تھیں جب تک اس منزل کو آپ کامل ایمان، عملِ صالح، کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دیں گے باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آ سکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انجام کب ملے گا۔ وہ ادعائے فرض کے معاملہ کو دکانداری بناتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں نتیجہ کب نکلے گا۔ فرض اس امر کا محتاج نہیں ہے کہ نتیجہ کیا ہو گا۔ اگر فرض فرض ہے

تو ہمیں چاہیے کہ ہم پورا کریں۔ نتیجہ پر غور کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ دنیا میں بیج ہے زمین ہے، انسان ہے اور اس دنیا پر خدا بھی ہے۔ کیا تم خدا کا کام خدا کی زمین پر کر سکتے ہو؟ تم تو یہ کر سکتے ہو کہ تمہاری جھولی میں جو دانہ ہے، زمین کے سپرد کردو پھر وہ خدا ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے اور اپنے بادل کو برساتا ہے اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کو بارآور کرتا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ زمین صالح ہو، دانہ سچا ہو۔ اگر تمہارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اپنے دل کی جس سرزمین میں ڈالا ہے وہ سرزمین شور نہیں ہے تو ضرور ہے کہ وہ دانہ زمین کے پردے کو چاک کرے گا اور اپنی کامیابی کا سر نکالے گا۔ اگر اس وقت میں آپ کے سامنے یہ لاؤں کہ جو ایمان کے علاوہ، عملِ صالح کے عام اور عالمگیر اصول کے علاوہ، حق پرستی کے عام اور عالمگیر اصول کے علاوہ، قربانی کے عام اور عالمگیر اصول کے علاوہ، ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں جو کام پیش ہیں، وہ کون سے ہیں۔ تو میرے دوستو! جلد بازی سے کام نہ لینا کہ وہ کام آج تحریکِ خلافت کے لیے کیا مفید ہو سکتے ہیں؟ تمہارا فرض یہ نہیں ہے کہ تم ان کاموں کو اختیار کرو جو تحریکِ خلافت کے لیے مفید ہیں، بلکہ تمہیں چاہیئے کہ تم وہ کام کرو کہ جو تمہارا فرض ہے۔ قربانیوں کی جو پہلی منزل تھی جب تک قدم اس منزل سے آگے نہ بڑھ جائے دعویٰ قربانی نہیں مانا جا سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ میری طرف نہ دیکھو، اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ وہ کپڑا جو تمہارے جسم پر ہے، وہ باریک ململیں جو تم نے اپنے جسموں پر لپیٹی ہیں اُن سے کتنی بڑی خدمت اپنے دشمنوں کی تم انجام دے رہے ہو تمہارے ملک سے نوے کروڑ روپیہ ہر سال ان کپڑوں کے ذریعہ ان خزانوں میں جاتا ہے جو پانچ سال سے اسلام کے مٹانے میں صرف کیا جا رہا ہے۔ ترکِ موالات میں اس سے بڑھ کر کوئی اور مسئلہ ہو سکتا تھا تمہارے عمل کے لیے یہ علت نہیں ہو سکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے

ہو۔ تمہارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ تمہارا پہلا فرض یہ ہے دیکھو کہ اپنے کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ اور تمہاری کامیابی کے لیے، خلافت کے لیے، سوراج کے لیے پہلی چیز یہ تھی کہ ملک کے اندر اپنی قربانی کا ولولہ پیدا ہو۔ مقصد کے لیے: ملک کے لیے، حق کے لیے تکلیف اٹھانے کا ایک ولولہ پیدا ہو۔ اس وقت ضرورت تھی کہ قربانی کا سبق آئے۔ جو سبق تمہارے سامنے آیا وہ جان، گردن اور رگوں کا نہ تھا۔ محض ان کپڑوں کا تھا۔ اگر اس کو تم کامیابی کے ساتھ طے نہیں کر سکتے، اگر تمہارے دل میں اتنا عشق نہیں ہے کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو، تو کیا تمہارے دل میں یہ آ سکتا ہے کہ تم خدا کی زمین میں بسنے کی ہمت کرو۔ غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ، جب تک ملک کی اس منزل کو طے نہ کرو قربانی کی کوئی منزل سامنے نہیں آ سکتی۔ تیس ستمبر کا زمانہ خلافت کمیٹی نے اسی لیے قرار دیا تھا مگر ہماری کامیابیوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی درد انگیز داغ نہیں ہو سکتا کہ تیس ستمبر کی صبح آئی اور ہماری غفلت پر رو کر چلی گئی۔ اب تک وہ لباس موجود ہے جس کی وجہ سے ہندوستان غلام بنایا گیا۔ جس کے ذریعہ ان کے بہترین مقاصد پامال کیے گئے۔ کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تم اپنی جانیں قربان کر سکتے ہو تو تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے لباس کو قربان نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے ہر ایک مسلمان اور ہندو کا سب سے بڑا پاک اور اشرف فرض ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس معاملہ کو کامیابی تک پہنچا دیں۔ جب تک یہ منزل طے نہ ہوگی اور کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام جوان کے جسم کی قربانی سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ معاملہ ہے کہ وہ ان باریک کپڑوں کو جو مانچسٹر اور لنکا شائر سے آتے ہیں اور ان کے ملک کو تباہ کر رہے ہیں، ان کو اتار دیں اور ان کو اپنے لیے جائز نہ رکھیں۔

دوسرا کام ان کے لیے اس جسم کی قربانی کے ساتھ اُن کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ وہ کونسی قربانی ہے؟ میرے دوستو! وہ مال کی قربانی ہے جس کے لیے تمہیں تیرہ سو برس سے پکارا جاتا ہے کہ اپنی جانوں اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ اگر آج مسلمانوں کے بس میں اتنا نہیں کہ وہ سمرنا پہنچیں اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں اپنی لاشیں تڑپائیں۔ اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کی روپیہ سے بھی مدد نہ کریں۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے کو مسلمان کہنے کا حق نہیں رکھتا، جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو آج حکومتِ انگورہ اور مجاہدینِ انگورہ کے لیے قربان نہ کردے۔

بلاشبہ مرکزی خلافت کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے اس امر کی تکمیل کے لیے کوشش کرتی، لیکن طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں۔ ضرورت تھی کہ جتنا روپیہ ہندوستان میں فراہم ہو اس کو براہِ راست غازی مصطفےٰ کمال پاشا تک پہنچانے کا مرکزی خلافت کمیٹی کوئی انتظام کرتی اور ملک کو دعوت دیتی۔ الحمد للہ مرکزی خلافت کمیٹی نے اس کا انتظام کر دیا کہ ہر اس پیسہ کو جو ہندوستان میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے لیے دیا جائے وہ براہِ راست غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے نام بھیجے اور براہِ راست ایک رسید ان کے ہاتھ کی حاصل کرلے۔ چنانچہ دس ہزار کی ایک قسط حال میں بھیجی گئی۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے آج مسلمانوں کو دعوت دی ہے اور ان کا فرض ہے کہ وہ انگورہ کے لیے اپنے مال کو قربان کریں۔ اور انگورہ و خلافت کے لیے اپنے جسم کو تھوڑا سا نقصان پہنچائیں۔ بدیسی کپڑے کو ترک کر دیں اور اپنے گھر کے صندوقوں کو صرف دیسی کپڑے سے بھر دیں۔

برادرانِ عزیز! یہ چند منتشر کلمات تھے کہ جن سے میں اس موقع پر اس مجلس میں آپ حضرات کی تواضع کر سکا۔ افسوس ہے کہ باوجود اختصار کے اپنے خیالات کی

رو میں بہتا چلا گیا اور محسوس نہ کیا کہ رات کا بہت بڑا حصہ گزر چکا ہے۔ اس حالت میں بہتر نہیں ہے کہ آج کے جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ آج کے جلسہ میں سے سب سے پہلے وہ نہایت اہم تجویزیں تھیں جن کو افتتاحی تقریر کے ضمن میں عرض کرنا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اب وقت زیادہ ہو گیا ہے اور اب موزوں نہیں کہ جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے اور کل کا اعلان ہے کہ صبح آٹھ بجے جلسہ کی دوسری نشست ہو گی امید ہے کہ آپ حضرات اسی جوش و عمدگی کے ساتھ اس جلسہ میں بھی حصہ لیں گے کہ جس عمدگی کے ساتھ اس جلسہ میں آپ نے حصہ لیا ہے۔ اس لیے کہ نہایت ضروری اور اہم گزارشات ہیں جو اس میں عرض کی جاویں گی۔ اس اعلان کے بعد آج کے جلسہ کے اختتام کا میں اعلان کرتا ہوں۔

اجلاس جمعیۃ العلماء ہند ——— لاہور

۱۸ ر نومبر ۱۹۲۱ء

تحریری

آج کرۂ ارضی کی خشکی و تری حق و عدالت سے محروم ہو گئی ہے۔ اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ بندوں کے لیے کوئی گوشۂ امن و عافیت باقی نہیں رہا ہے۔ گویا زمین کی تمام پچھلی نامرادیاں لوٹ آئی ہیں اور تاریخِ عالم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں۔ ہر زمینِ اصحاب کہف کا جبر و طغیان، فراعنۂ مصر کا ظلم و استبداد، نمارودۂ کلدان کا غرور و تمرد، اصحابِ مدین کا انکار و اعراض، قومِ عاد کا فسق، عمد علاوہ ان یہ سب کچھ بہ یک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ!

الحمد لله الذی جعلنا امّۃً للتوحید وجعل دیننا دین التوحید وسیاستنا سیاسۃ التوحید واعز من استقاموا امنا علی التوحید و اذل من انحرف عن جھۃ التوحید لیعبدنا کما بدأنا الی التوحید انہ ھو یبدئ و یعید و ھو الغفور الودود ذو العرش المجید فعال لما یرید۔

والصلوٰۃ والسلام علی محمد خاتم انبیآئہ و رسلہ وصفوتہ من خلقہ الذی بعثہ بتوحید الالوھیۃ، والربوبیۃ، لیحرز الخلق من رق العبودیۃ للعوالم السماویۃ او الارضیۃ و بتوحید السیاسیۃ لتکون الشعوب والقبآئل امۃ واحدۃ تضمنھا شریعۃ ھادیۃ واحدۃ لیطلقھم من قیود الحکومۃ المستبدۃ الجائرۃ ویفکھم من اغلال الجنسیۃ الخاسرۃ فعز باتباعہ المومنون وذل باعراضھم عنہ المعرضون وانہ لکتاب عزیز لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

اما المستادات! جمعیۃ العلماء ہند کا یہ تیسرا سالانہ اجتماع ہے جس کی صدارت

کے لیے آپ نے اس عاجز کو منتخب فرمایا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی عزت ہے جو ہندوستان کی اسلامی آبادی میں کسی خادم علم و ملت کو حاصل ہو سکتی ہے لیکن دنیا کی تمام نعمتوں کی طرح ادائے فرض و مسئولیت کا بارِ گراں بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ میں آپ تمام بزرگانِ ملت کا شکر گزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے لطف و کرم نے میری بے بضاعتی کو قبول فرمالیا ہے اسی طرح آپ کی رفاقت و مساعدت میری کمزوریوں اور درماندگیوں کے لیے بھی پردہ پوش ہوگی۔ آیئے! عزم و عمل کی اس نازک اور پر آشوب گھڑی میں ہم سب کے دل اس کارفرمائے حقیقی کے آگے جھک جائیں، جس کے فضل و کرم کے بغیر ہماری کوئی سعی و جستجو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ کریم کارساز ہماری درماندگیوں اور بے چارگیوں پر رحم فرمائے۔ ہماری خطاؤں اور لغزشوں کو بخش دے، اپنی رحمتوں اور برکتوں کا دروازہ ہم پر کھول دے اور اس چارہ ساز کی دستگیریوں سے ایسا ہو کہ ہم سب کی نیتیں خالص، ہم سب کے اعمال صالح، ہم سب کے ارادے راسخ، اور ہم سب کے قدم جادۂ حق و صدق اور صراطِ مستقیم پر قائم و استوار ہو جائیں۔ ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھیٔ لنا من امرنا رشدا۔

حضرات علمائے کرام! قبل اس کے کہ ہمارا سفرِ نظر و فکر شروع ہو مجھے ایک لمحہ کے لیے ان عزیزانِ ملت سے مخاطب ہونے دیجیے جو آج آپ کی مجلس میں چشم نظارہ اور دلِ پُر شوق لے کر شریک ہوئے ہیں۔

اے عزیزانِ ملت! آیئے ایک نظر اس منظر پر ڈال لیجیے جو اس وقت آپ کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ آپ میں بہت سی آنکھیں ایسی ہوں گی جنہوں نے دنیوی جاہ و جلال کے بڑے بڑے منظر دیکھے ہوں گے۔ بہت آنکھیں ایسی ہوں گی جن کے سامنے بارہا اربابِ حکومت و دولت کی شان و شوکت نے جلوہ فروشیاں کی ہوں گی۔ اور عجیب نہیں کہ کچھ نظریں ایسی بھی ہوں جو حکمرانوں کے درباروں کی ہیبت و جبروت کا نظارہ

کرچکی ہوں۔ لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کشش و نظر فریبی کے ان تمام سامانوں اور جلودں میں سے کوئی ایک بات بھی یہاں نظر نہیں آتی۔ دولت کی شان و شوکت کا یہاں نام و نشان نہیں ہے۔ دنیوی حکومت و فرمانروائی کی نمود و نمائش سے یہاں کا گوشہ گوشہ خالی ہے۔ نہ زریں لباسوں کی آرائش ہے، نہ مسند نشینوں کی زیبائش۔ فقرائے علم کا مجمع ہے، بوریا نشینانِ حق کی مجلس ہے۔ نیاز مندانِ صدق و بے نیازانِ دنیا کا جمگھٹا ہے۔ یہاں آپ کو اس دنیا کی شان و شوکت نہیں مل سکتی جسے چھوڑ کر اس وقت آپ آرہے ہیں۔ البتہ اگر اقلیم حق اور شہرستانِ صدق و صفا کا جاہ و جلال دیکھنا مطلوب ہو تو ان ہی فقرائے علم کے پھٹے پرانے کپڑوں اور بے شکوہ صورتوں کے اندر ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا مجمع ہے جنہوں نے فقر و فاقہ کو ہمیشہ اپنی دولت سمجھا۔ زہد و انقطاع کو اپنی اقلیمِ استغنا کا تاج و تخت بنایا۔ بے نیازی و بے مرادی کے لازوال خزانوں پر ہمیشہ قانع رہے اور عشق حق اور پرستاریٔ علم کے بوریائے کہنہ پر بیٹھ کر دنیا اور دنیا کی ساری عظمتوں سے بے پروا ہے۔ لیکن بایں ہمہ جن کے کبرِ حق اور سطوتِ الٰہی کا یہ عالم رہا کہ شاہانِ عالم نے ان کے پھٹے پرانے دامنوں پر عقیدت و اطاعت کی آنکھیں ملیں اور تاج و تخت حکومت کو ہمیشہ ان کے پائے استقامت کی ٹھوکریں نصیب ہوئیں۔ انہوں نے اللہ کی چوکھٹ پر سرِ نیاز جھکا کر تمام کرۂ ارضی کی عظمتوں اور رفعتوں کو اپنے سامنے سرنگوں کر دیا تھا۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

یہ سچ ہے کہ آج یہ خود اپنی ہی غفلت اور خود فراموشی کی بدولت اپنی وہ رفعت و عظمتِ الٰہی کھو چکے ہیں اور اب ان کی عظمت و جلال کی حقیقت بھی تاریخ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے خدا نے ان کو جس منصبِ عظیم و جلیل پر سرفراز فرمایا تھا

اس کی قدر انہوں نے نہ پہچانی اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی شرف وعزت کا خلعت پارہ پارہ کر دیا۔ خدا نے دنیا کو اُن کے سامنے گرایا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ خود دنیا کے سامنے گر گئے۔ خدا نے ان کو صرف اپنی ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا، لیکن انہوں نے انسانوں کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کی۔ جب اللہ اور اس کے کلمۂ حق کی جانب سے ان کے دل غافل ہو گئے تو دنیا نے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے لیکن اے لطارگیانِ مجلس! خواہ زمانے کے انقلابات وحوادث نے انہیں کتنا ہی حقیر و بے مرتبت بنا دیا ہو لیکن خدارا آپ چشمِ حقارت سے نہ دیکھیں یہی ہیں جنہوں نے اس دنیا میں خدا کے رسولوں نیابت کی ہے۔ یہی ہیں جو ان کی وراثت کے متقسار ٹھہرے ہیں، یہی ہیں جن کے ہاتھوں میں امتِ مرحومہ اور خیر الامم کی قیادت وہدایت کی باگ رہی ہے۔ یہی ہیں جو آج تیرہ سو برس سے خدا کی زمین پر اُس کے کلمۂ حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہی ہیں جن کی عظمتِ لازوال کے نقوش صفحۂ عالم پر ثبت ہیں اور جن کی ہیبت وسطوت کے افسانے آج تک زبانِ تاریخ پر جاری ہیں۔ اور پھر یاد رکھیے کہ یہی ہیں جو باوجود اپنی تمام کوتاہیوں اور درماندگیوں کے اب بھی آپ کی قسمت کے مالک اور آپ کی سعادت وشقاوت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ آپ کو اگر زندگی مل سکتی ہے تو صرف ان ہی کی اطاعت اور پیروی سے۔

حضرات! ہمارا یہ اجتماع ایک اجتماعی عمل ہے۔ ہم سب جمع ہوئے ہیں کہ اپنے گم کردہ مقصد کی جستجو کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمتِ الٰہی نے تمام اعمال کامیابی کے لیے جو شرائط مقرر کر دی ہیں۔ وہ اس عمل کی کامیابی کے لیے بھی ضروری ہوں۔ پس ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ مقصد کی جستجو سے پہلے خود اپنے اندر اُن شرائط کی جستجو کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا کی ہیں۔ دماغ دیا ہے جو ارادہ کرتا ہے اور اعضاء جوارح دیے ہیں۔ جو اس ارادے کو فعل میں لاتے ہیں۔ پس ہر انسانی عمل کی کامیابی کے

لیے قدرتی طور پر دو باتیں ضروری ٹھہریں۔ ارادہ کا صحیح ہونا اور فعل کا صحیح طریقہ پر انجام پانا۔ دنیا کا کوئی عمل نہیں جو ان دو شرطوں کے بغیر وجود میں آسکے۔ علوم واخلاق میں ان ہی دو حقیقتوں کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ عزم، منصوبہ، تصور، اعتقاد وغیرہ سب سے وہی حقیقت مراد ہے، جو افعال سے پہلے وجود میں آتی ہے اور افعال کے لیے بمنزلہ علت وسبب کے ہوتی ہے۔ جب تک وہ صحیح نہ ہوگی فعل بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ بریڈلا ہال کی عمارت ہے جس میں ہم سب آج مجتمع ہوتے ہیں، یقیناً اس کی دیواریں اور محرابیں ہاتھوں نے چنیں اور اینٹ گارہ اپنا کر تیار کی گئیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ وجود میں آسکتا اگر معمار اور انجینئر کے دماغ میں پہلے اس کا صحیح نقشہ ارادہ و تصور کی حالت میں نہ کھنچ جاتا۔ پہلے یہ ہال انجینئر کے دماغ میں بن چکا، تب کہیں جاکر اس زمین پر وجود میں آیا۔ اس حقیقت کو شریعت نے ایک جامع اصطلاح میں نیت اور عمل سے تعبیر کیا ہے۔ اور تمام ایمانیات وعبادات کو ان ہی دو حقیقتوں کی تصحیح واصلاح سے مرکب کیا ہے۔ نیت دماغ کا ارادہ اور دل کا یقین و اعتقاد ہے۔ اور عمل اس کا ظہور ہے جو ظاہر میں مرتب ہوتا ہے پس شریعت بتلاتی ہے کہ تمام کاموں کی کامیابی کے لیے پہلی شرط نیت کی تصحیح اور درستگی ہے۔ یہی اصل جڑ ہے، باقی سب شاخیں انما الاعمال بالنیات اور لکل امرئ ما نوی فمن کانت ہجرتہ الی اللہ و رسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرتہ الدنیا یصیبہا او امرأۃ یتزوجہا۔ فقیہ الامت حضرت امام بخاری نے اسی لیے جامع الکلم کو اپنی جامع صحیح کا سرنامہ وعنوان قرار دیا کیونکہ تمام اعمال کی بنیاد اور تمام ایمانیات وعبادات کی اصل یہی قانونِ الٰہی ہے اور اسی لیے جو کچھ بھی اس کتاب میں روایت کیا گیا ہے وہ سب کا سب اسی کی شرح اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

حضرات! آپ نے اپنے بزرگانہ لطف وکرم سے جو خدمت میرے سپرد کی ہے میں اس کی انجام دہی میں خیانت کروں گا اگر اس کی طرف سب سے پہلے آپ کو توجہ نہ دلاؤں

اس راہ کی سب سے پہلی شرط نیت کا اخلاص ہے۔ اور ہر اس قلب پر فلاح و کامیابی کی لذت حرام ہے جو اخلاصِ نیت کی دولت سے محروم ہو۔ اخلاصِ نیت سے مقصود یہ ہے کہ جو کام کیا جائے اس سے مقصود صرف ادائے فرض ہو اور اللہ اور اس کی مرضیات ہوں ومن النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ غرض نفس اور ذات کی خواہشوں اور آلودگیوں کو اس میں دخل نہ ہو، قرآنِ حکیم نے جا بجا انبیاء کرام علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ حسنہ ہمیں بتلایا ہے کہ خدمتِ انسانی اور دعوتِ امت کی راہ میں ان کا اعلان کیا تھا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت امام دارمی نے روایت کیا ہے کہ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اللھم اجعل عملی کلہ صالحاً واجعلہ لوجھک خالصاً ولا تجعل لاحد فیہ شیئاً

حضرات! گزشتہ پچاس برس سے ہندوستان میں مختلف اغراض و مقاصد سے مجالس و اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور جہاں ان کا وجود ہمارے تمام اجتماعی اعمال کے لیے بحکم شوریٰ ضروری ہے وہاں نیات و مقاصد کے لیے ایک نئی امتحان گاہ بھی پیدا ہو گئی ہے ان مجالس میں شہرت کے ذرائع ہیں، ترفع کے مواقع ہیں، نمود و نمائش کے مطامع ہیں۔ ان میں تقریریں کی جاتی ہیں، جن کی تحسین میں نعرہ ہائے توصیف بلند ہوتے ہیں۔ ان کے عہدے اور مناصب ہیں جن کے لیے امیدواروں میں منافست و مسابقت کی کشمکش ہے۔ ان کی صدارت و ریاست ہے جس کی طمع بسا اوقات ہمارے اخلاصِ عمل پر غالب آ جاتی ہے۔ پس ہم سب کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اپنی اپنی نیتوں اور دلوں کا کامل راست بازی کے ساتھ مراقبہ کریں اور ان مہلکاتِ راہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں ہمارا مقصد نہایت عظیم ہے اور ہم نے ادائے فرض اور خدمتِ انسانی کی ایک ایسی راہ میں قدم رکھا ہے جس سے بڑھ کر ذمہ داری کی انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہو سکتی ہمارے کندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق

کی شہادت اور امتِ مرحومہ کے احیاء و تجدید کا عظیم الشان کام ہے۔ حیف ہے اگر ایک ایسے مقدس کام اور پاک کام میں بھی اپنی نیتوں کو پاک نہ رکھ سکیں، اور اغراض و اہوا کی ایک ادنیٰ کدورت بھی ہمارے دلوں کو ملوث کر سکے۔ پس ہر حال میں پہلا کام تصحیح و اخلاصِ نیت کا ہے۔ جب تک اس اولین منزل سے قدم کامیاب نہ گزر جائیں گے۔ فوز و فلاح کی کوئی منزل رونما نہیں ہو سکتی۔

دوسری شرط اس راہ کی صحتِ عمل ہے مقصود یہ ہے کہ جب ارادہ و اعتقاد صحیح ہو گیا تو اب اس کو فعل میں لانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جائیں وہ نہجِ حق و صواب پر ہوں۔ یعنی ہر طرح کی گمراہی، کجروی اور کمزوری و نقائص سے محفوظ ہوں۔ اس بارے میں قرآنِ حکیم نے ہمیں بتلایا ہے کہ تمام برکاتِ عمل کا اصلی مبداء اور سرچشمہ انبیائے کرام علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ اور پانچ وقت ہم خدا کی سکھائی ہوئی یہ دعا مانگا کرتے ہیں۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سورہ نساء میں بتلا دیا ہے کہ جماعت مَنْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ کون ہے؟ فرمایا ہے سب سے پہلا طبقہ ان میں انبیائے کرام کا ہے۔ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا پس صرف وہی عمل قبول ہو سکتا ہے جو وجہِ صواب پر ہو۔ اور وہ نہیں ہے مگر انبیائے کرام کا اسوہ جو عمل اس طریقۂ نبوت سے متحقق اور منہاجِ نبوت کے قدم بقدم نہ ہو گا وہ کبھی مقبول و مشکور نہیں ہو سکتا۔

حضرات! یہی دو شرطیں ہیں جن کی تکمیل پر ہمارے تمام اعمال کی کامیابی بھی موقوف ہے۔ کتنا ہی بہتر طریقِ صواب اختیار کیا جائے۔ لیکن اگر اخلاصِ نیت کی رو سے عمل خالی ہو گا تو کبھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اسی بنا پر صحابہ و سلف سے

آیہ کریمہ لِیَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً کی تفسیر میں منقول ہے (کما ذکرہ ابنِ عساکر وابن کثیر والسیوطی وغیرھم) ای خلصہ واصوبہ پھر اس کی تشریح کی۔ إذا كان العمل خالصا ولم يكن صوابا لم يقبل واذا كان صوابا ولم يكن خالصا لم يقبل حتى يكون خالصا صوابا والخالص ان يكون لله والصواب ان يكون على السنة لیکن سنت سے یہاں مراد صرف عبادات وطاعت کی سنن نہیں ہے بلکہ اعمالِ نبوت کے تمام سنن ولوازمیں مقصود ہیں جن کی راہیں اللہ تعالیٰ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر کھول دیتا ہے اور وہ ان کے ذریعہ معالجۂ نفوس وتزکیۂ قلوب وتشکیل جماعت وتاسیسِ امتِ صالحہ کا عملِ عظیم انجام دیتے ہیں۔ یہ بات کہ انسانوں کی بھیڑوں کو ایک منظم ومقوم امتِ صالحہ عاملہ کی شکل میں بدل دینا اور بکھرے ہوئے اجزا سے ایک متحدو موتلف جسم میں تو میت ڈھال لینا اور تمام امراضِ اجتماعیہ کی مداوی وطبابت سے عہدہ برآ ہونا ایک خاص عملِ نبوت ہے، اور انبیائے کرام کے بعد صرف وہی ورثائے نبوت اس عمل کو انجام دے سکتے ہیں، جو اسوۂ حسنۂ نبوت سے متاثی ہوں۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے حکمت نبوت کے اسرار وغوامض کا دروازہ وراثت ونیابت کھول دیا ہو۔ شرح اس اجمال کی بہت طولانی ہے۔ یہاں صرف اشارہ مقصود ہے۔

حضرات علمائے کرام وارکانِ جمعیۃ! اس وقت ایک بہت بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لیے درپیش ہے، ہم نے مدتوں کی غفلت کے بعد قومی واجتماعی عمل کی کشمکش وکشاکش میں قدم رکھا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی واجتماعی کاموں کے طرق واسلوب پر پڑتی ہے۔ اور تقلید ومحاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت وحکمت نبوت کی سنت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے

تمام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ آپ اس لیے نہیں ہیں کہ انسانوں کے بناتے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں، بلکہ آپ کو علم و عمل شریعت اس لیے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف امید و طلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لیے اتباع و تقلید کا پیام ہو۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول کی سنت ہے اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبدأ علم اور سرچشمۂ حکمت ہو سکتا ہے جو انسانی اعمال کے تمام اصول و فروع کے لیے دنیا میں وجود رکھتا ہو۔ دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمالِ نبوت ہیں۔ اس کے سوا علم و یقین کا اس سمار دنیا کے نیچے وجود نہیں۔ اس کے ماسوا جس قدر بھی ہے، قرآن پکار پکار کے کہتا ہے کہ ظن ہے، تخمین ہے، قیاس ہے، اٹکل ہے، تخریص اور تلعب بالریب ہے ظلمت ہے ظلمات بعضہا فوق بعض ہے۔ علم، یقین، برہان، بصیرت، فرقان، النور، اور نور اعلیٰ نور تو صرف امی اعلم الخلائق اور اعرف العباد کی درس گاہ سنت و حکومت سے مل سکتا ہے، جو شک کی جگہ یقین کا، جہل کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن و رائے کی جگہ بینہ و حجۃ کا، قیاس و تخمین کی جگہ، برہان و فرقان کا اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ نور کا، تبیانا لکل شئ کا اور عروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا کا تمام نوعِ انسانی کے سامنے اعلان کر رہا ہے اور تمام کرۂ ارضی کو یہ کہہ کر بلا رہا ہے۔ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ط

پس اے علمائے ملت! آپ کو اپنے طریق عمل و نظم کار کے لیے صرف کتاب و سنت کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہئیں، دنیا علم و بصیرت کے لیے آپ کی محتاج ہے۔ آپ کو علم و بصیرت کے لیے دنیا والوں کی احتیاج نہیں ہے۔

حضرات! اس تمہید کے بیان کے بعد میں بالکل آمادہ تھا کہ مقاصد مطالب کا

سفر شروع کروں. لیکن اچانک غمگین حادثہ کی یاد نے میرے قدم روک دیے. آپ کی اس جمعیت کا گزشتہ اجلاس مجمع علماء ہند کے جس بزرگ و محترم وجود کی رہنمائی و صدارت میں منعقد ہوا تھا، آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا. اور اس کی موجودگی کی برکتوں سے محروم ہو گئے ہیں. میرا اشارہ حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی ذاتِ گرامی کی جانب ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آج آپ میں سے ہر فرد کو ان کی یاد دعوتِ غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشبہ ایک قومی ماتم ہے اور سب کو ان کی یاد کی عزت میں چند لمحوں کے لیے رک جانا چاہیے۔ حضرات! مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دورِ علما کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہدِ حرمان و فقدان میں علمائے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا وہ علماء ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد اُن کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انہیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی کہ اسلام و ملتِ اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا۔ اور انہوں نے اعدائے حق کی مرضیات و اہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔ فی الحقیقت انہوں نے علمائے حق و سلف کی سنت زندہ کر دی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنتِ حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی روحِ عمل موجود ہے اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں۔

وما دام ذکرا لعبد بالفضل باقیاً

فذالک حی وھو فی التراب ھالک

حضرات! ٹھہریے۔ ابھی ایک اور جماعت بھی ہے جو آپ کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہ ہمارے رفقائے طریق ہیں جو کل تک ہمارے ساتھ دعوت و تبلیغ حق میں سرگرم تھے۔ اور جن کو آج اس جمعیت کی صفِ اولیں میں ہونا تھا. مگر

وہ یہاں نظر نہیں آتے۔ وہ اِس وقت آپ کو کہاں ملیں گے؟ آپ انہیں اس مصرِ فراعنہ میں نہ ڈھونڈیں، جس کی وسیع آبادی اگر آلِ فرعون کے لیے عیش کدۂ حکومت و آزادی کا حکم رکھتی ہیں مگر اسیرانِ بنو اسرائیل کے لیے سرتاسر زندانِ استبداد ہیں۔ وہ آپ کے کنعانِ ملت کے عزیزِ گم گشتہ ہیں۔ اگر آپ ڈھونڈتے ہیں تو اسی یوسف کدۂ عزت و اقبال میں ڈھونڈیے جہاں اگرچہ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ کے زنجیر و طوق میں وہ گرفتار ہیں مگر فی الحقیقت إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ اور كَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ کا تاج و تخت فتح و مراد بھی اسی زنجیر و طوق سے ڈھالا جا رہا ہے۔

قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔

حضرات! قرآنِ حکیم نے ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ لَّقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ حضرت یوسف مصر کے بازاروں میں غلام بنا کر فروخت کیے گیے۔ پھر ان کے سامنے دو راہیں کھلیں۔ ایک میں اللہ کی معصیت تھی اور ایک میں انسان کا ظلم۔ انہوں نے قید خانہ کی مصیبت گوارا کرلی، مگر معصیت کی عیش و آزادی گوارا نہ کی۔ ان کو حق کی فتح اور ظلم کے خسران پر اس قدر یقین و ایمان تھا کہ خوشی خوشی قید خانے چلے گئے اور ان کی روح ہمیشہ اس یقین سے معمور رہی کہ اگر وہ حق پر ہیں تو بالآخر کامیابی و فتحمندی ان ہی کے حصے میں آئیگی۔ ان کے استغراقِ ایمان و ادائے فرضِ دعوت کا یہ حال تھا کہ قید خانے میں بھی زبان کھلی تو اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ حق و ہدایت کی تبلیغ و دعوت ہی کے لیے کھلی يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ بالآخر جب فیصلۂ حق و باطل کا وقت آگیا تو نصرتِ الٰہی ظاہر ہوئی اور جو زنجیریں قید خانہ مصر میں پہنائی گئی تھیں وہی بالآخر مصر کا تاج و تخت بن کر نمودار ہوئیں۔ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ

وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ج فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ط تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ہ اس اسوۂ یوسفی کے بصائر و عبر بے شمار ہیں، مگر زیادہ نمایاں حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص تاج مصر سر پر رکھنے کا طلبگار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے زندانِ مصر کے طوق و زنجیر کو اپنے دست و گردن کا زیور بنا لے۔ ہم تختِ مصر کا جاہ و جلال دیکھ کر للچانے لگتے ہیں مگر زندانِ مصر کی قید و محن فراموش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ طلبگارانِ تاجِ آزادی کے لیے پہلی منزل زندان و قید ہی کی ہے

اے کہ از دیدارِ یوسف غافلی
داغِ یعقوب و زلیخا را نگر

بلاشبہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چشم شوق ایک مدت کے ہجر و فراق کے بعد جمالِ یوسفی سے روشن ہوئی۔ مگر معلوم ہے کہ فتح و مراد کی روشنی سفیدی چشم سے چمکتی تھی جو ایک مدت مدید کے صبر و طلب سے دیدۂ یعقوبی میں پھیل چکی تھی۔ پس اس راہ میں پہلی آزمائش صبرِ کامل اور طلبِ صادق ہی کی ہے۔ جب تک طلبِ یعقوبی حاصل نہ ہو، طلعتِ یوسفی نظر افروز نہیں ہو سکتا۔

یا من شکی شوقہ من طول فرقتہ
اصبر، لعلک تلقی من تحب غدا

مولانا روم کے اشارات اس مقام پر کیا لطیف و بدیع ہیں

تو کہ یوسف نیستی یعقوب باش	روز و شب در گریہ و آشوب باش
پیشِ یوسف نازشِ خوبی مکن	جز نیاز و آہِ یعقوبی مکن

سورۂ یوسف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر ایک غلام زندانی اپنے حسن عمل و استقامت سے ملک کے تاج و تخت کا مالک ہو جا سکتا ہے، تو کیا ایک پوری قوم ایمان

وغیرہ کے غیر مسخر اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس نہیں لے سکتی؟

ہزار رخنہ بدام و مرا بہ سادہ دلی
تمام عمر در اندیشہ رہائی یافت

حضرات! الحمد اللہ کہ اسوۂ یوسفی کے اتباع و تاسی کا باب سعادت ملک و ملت پر کھل چکا ہے۔ اور زندانِ ہند میں اب روز بروز آزادگانِ حق کی تعداد بڑھتی جاتی ہے ابھی ابھی ہم ملک و ملت کے محبوب و محترم پیشواؤں کو کراچی کے قید خانے میں وداع کر کے آئے ہیں اور آپ کی جمعیتہ کے سرگرم و فدا کار ناظم مولانا احمد سعید دہلی سے میانوالی کے جیل میں اس طرح پہنچائے گئے ہیں کہ ان کے جسم پر قیدیوں کا کمبلی پڑا تھا اور ہاتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے تھے۔

وحدثتنی یا سعد عنہا فزدتنی
جنونا فزدنی من حدیثک یا سعد

حضرات! اگر اللہ کی محبوبیت، خدمت ملت کی لازوال عزت، دعوت و شہادت حق کا شرف بے مثال صرف ان ہی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کے معاوضہ میں مل رہا ہے تو اس سے زیادہ ارزاں سودا اور کون ہو سکتا ہے۔ اور ہزار رشک و مسرت ان خوش نصیبوں پر جو اس دولت بے کراں اور سعادت بے ہمتا سے شاد کام ہوتے۔ حضرات! یقیناً یہ وہی وقت ہے جس کی صحاح کی حدیث میں خبر دی گئی تھی۔ الصبر فیھن کالقبض علی الجمر ان وقتوں میں ایمان و حق پر استقامت ایسی مشکل ہو جائے گی جیسے انگاروں کو مٹھی میں لینا۔ سو واقعی آج یہی حال ہو رہا ہے۔ آج ایمان پر قائم رہنا گویا آگ سے کھیلنا ہے۔ اور جو شخص اس کے لیے تیار نہیں اُسے چاہیے کہ اس شعلہ زار حق پرستی سے ہٹ جائے اور اُسے جانبازانِ ایمان کے لیے چھوڑ دے۔

گریز دا ز صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست　　کسے کہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست

حضرات! خدارا بتلایئے! میں اپنے خون چکاں زخموں کا مرہم کہاں ڈھونڈوں۔
کون ہے جو اس درد و غم کا لذت شناس ہو سکتا ہے جس کو برسوں سے اپنے سینۂ مجروح میں چھپائے ہوئے ہوں جب سوچتا ہوں کہ ہمرہانِ طریق آج قید خانوں میں اسیر ہیں اور میں نامراد جلسوں کی صدارتیں کرتا پھرتا ہوں تو یقین کیجئے کہ مجھے اپنی اس زندگی اور نام نہاد آزادی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ اور میں لفظوں اور صداؤں میں اس درد و غم کی کشمکش ظاہر نہیں کر سکتا جس سے میرا سینہ شق ہونے لگتا ہے۔ اگر احادیث میں رد کا دگیا ہوتا کہ مومن کو ابتلا کی تمنا نہیں کرنی چاہیے تو یقین کیجئے کہ میں اس آزادی سے اس قدر اُکتا گیا ہوں کہ قید و بند کی آرزو میں کرتا اور اس کے لیے خدا سے دُعائیں مانگتا۔ اس پر بھی آپ کو معلوم ہے کہ قطع نظر ایام گذشتہ کے پچھلے دو ماہ کے اندر میں اپنی جانب سے بار بار معاملہ کو انتہا تک پہنچا چکا ہوں۔ مگر نہیں معلوم کیا بات ہے، ساری دنیا گرفتار کی جا رہی ہے مگر مجھ مشتاق کے نام کوئی پیام نہیں آتا۔

دیوانہ بدا ہے رود و طفل بہ راہے
یاراں مگر ایں شہر شما سنگ ندارد

حضرات! مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے دلوں کی بھی ترجمانی کروں گا، اگر ان تمام عزیزانِ ملت کو آپ کی جانب سے پیام محبت و تشکر پہنچاؤں۔ پس ان سب پر سلام جو دین وملت کے نام پر زندانہائے ہند میں اسیر ہیں۔ اور ان سب کے لیے ہمارے دلوں کی مخلصانہ تبریک، ہماری روحوں کا لازوال عشق اور اللہ کی خوشنودی و محبت کی ابدی و سرمدی بشارت۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب یا تو ہم خود ان تک پہنچیں گے یا ان کو اپنے حلقہ محبت و شوق کے اندر موجود پائیں گے۔

حضرات! ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے کہ میں نے اس خطبہ کو شروع کرتے ہوئے اپنے دعائیہ کلمات کا خاتمہ اس دعا پر کیا تھا۔ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ

اَمْرِنَا رَشَدًا! آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ دعا بھی منجملہ ادعیۂ قرآنیہ کے ہے۔ اور سورۂ کہف میں بتلایا گیا ہے کہ اصحابِ کہف نے اتباعِ حق کی راہ میں اپنے وطن و دیار کو چھوڑتے ہوئے مقدس دعا مانگی تھی۔ اصحابِ کہف سے مقصود چند بندگانِ مومن و مخلص ہیں رَبِّیْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِہِمْ جو ایک ایسی آبادی میں بستے تھے جس میں ہر طرف ظلم و ضلالت کی حکومت چھائی ہوئی تھی۔ اور کوئی گوشۂ امن و عافیت ایسا نہ تھا جو پیروانِ حق کے لیے مامن و ملجا ہو سکتا۔ اُن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ اور طریقِ حق کو چھوڑ کر بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف ایک ہی پروردگارِ عالم پر ایمان رکھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہمارا سر اس کے آگے جھک چکا۔ اب اور کسی ہستی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلٰـہًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔ لیکن یہ حق پرستی ان کے حکمران ملک کے قانون میں سب سے بڑا انسانی جرم ٹھہری اور جب کہ ان کی آبادیوں میں ظلم کے لیے عیش و آزادی تھی، کفر کے لیے عافیت تھی، گمراہی کے لیے امن تھا۔ تو ان عشاقِ حق کے لیے صرف جنگلوں کے بھٹ اور پہاڑوں کی غاروں ہی میں امن و نجات کا گوشہ باقی رہ گیا تھا۔ بالآخر آبادی سے نکل کر ایک پہاڑ کی غار میں پوشیدہ ہو گئے اور انسانی آبادی کا دروازہ جن مظلوموں پر بند ہو گیا تھا ان کے لیے خدا کے پہاڑ نے اپنا آغوش کھول دیا۔ حضرات! عہدِ قدیم کی یہ ایک داستانِ عبرت ہے جو کلامِ الٰہی نے ہمیں سنائی ہے اِس بارے میں قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان آپ کو معلوم ہے کہ وہ حکم فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم کو مستقبل کے لیے اور رفتہ کو آئندہ کے لیے بیان کرتا ہے۔ اور ہر اعمالِ انسانی کے یکسان و یک رنگ حوادث و ایام کو بطورِ تاریخی استقرار کے مرتب کر کے دائمی نتائج و عواقب کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلسل یا متفرق قصص و ایامِ ماضیہ کا ذکر کیا ہے، صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ مقصد جمع تاریخ اور نقل و حکایات نہیں

ہے بلکہ وہ حقیقت ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد تاریخ افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس کے وجود میں دنیا کے لیے کوئی سود اور فائدہ باقی نہیں رہتا، یعنی موعظہ و تذکیر، انتباہ و اعتبار، واقعات و حوادث کے تسلسل و یکرنگی سے قوانینِ عالم کا ادراک و انکشاف اور گزشتہ سے آئندہ کا استنباط۔ چنانچہ سورۃ ہود میں جس کا محورِ بیاں یہی حقیقت ہے فرمایا وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ اور عہدِ نوح سے لیکر عہد موسوی تک کے ایام کا ذکر کر کے نتیجہ نکالا وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ نیز سورہ یوسف کے آخر میں فرمایا وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ یعنی کائناتِ ہستی کی آیتوں میں سے ایک آیت تو ملکوت السمٰوت کی ہے جس کا تفکر مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا اور إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا الخ۔ کا بابِ عرفان و حقیقت کھولتا ہے اور دوسری قسم آیاتِ ارضیہ کی ہے اور آیاتِ ارضیہ میں سب سے زیادہ نمایاں آیت حوادث و ایام کی ہے جو ہمیشہ قوموں اور ملکوں پر گذر چکے ہیں۔ اور اب یا تو صرف ان کی داستانیں زبانوں پر باقی رہ گئی ہیں یا اطلال و آثار ہیں۔ بہت سے مٹ چکے اور بہت سے ٹوٹی ہوئی دیواروں اور کھنڈروں کی شکل میں عبرت سرائی کے لیے باقی ہیں۔ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ پس اس آیت میں حوادث و ایامِ امم کو بھی زمین کی آیتوں سے تعبیر کیا گیا اور اسی طرح سورۃ یونس، اعراف، شعرا وغیرہا میں بیانِ واقعات کے بعد فرمایا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ۝ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ سورہ نور میں بالکل واضح کر دیا وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ۔ اور عام طور پر بھی ہر جگہ ایامِ گزشتہ سے نتائج و

عبر اخذ کیے ہیں اور انسان کی غفلت و اعراض پر افسوس کیا ہے کہ وہ آنکھ رکھ کر بھی نہیں دیکھتا اور کان رکھ کر بھی نہیں سنتا۔

غرض قرآنِ حکیم کا مقصد قصص و اخبار سے موعظت و تذکیر ہے۔ آج کل فلسفۂ تاریخ کے بعض جدید مذاہب نے تاریخ اقوام سے قوانینِ اجتماع اور طبیعتِ اقوام کے اصول اخذ کیے ہیں لیکن قرآنِ حکیم نے موعظت و تذکیر کے ایک نقطہ میں بے شمار حقائق و معارف کے ساتھ اِس حقیقت کو بھی آشکار کر دیا ہے۔ قرآن کا استدلال اس بارے میں یہ ہے کہ جس طرح عالم جسمانی و مادی کیلئے ایک قانونِ طبیعت ہے اور اشیا کے خواص و آثار ہیں جو کبھی اُن سے علیحدہ نہیں ہو سکتے پانی ڈوباتا ہے، آگ جلاتی ہے، زہر کی ہوست ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ صالح غذا سے جسم نشو و نما پاتا ہے، ٹھیک اسی طرح عالم معنویات کے لیے بھی ایک قانونِ طبیعت ہے اور دیگر اشیا کی طرح عقائد و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں جو کبھی ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔ باطل کے لیے ہمیشہ مٹنا ہے اور حق کے لیے ہمیشہ قائم رہنا ہے۔ فساد کا خاصہ ہمیشہ ہلاکت ہے اور اصلاح کا نتیجہ ہمیشہ زندگی۔ ظلم و جور ضرور ہے کہ جب کبھی ہو بالآخر شکست کھلئے اور عدل و صداقت کے لیے ضروری ہے کہ جب کبھی ہو فتح پلئے۔ قرآنِ حکیم نے اسی قانونِ معنوی کو جا بجا سنۃ اللہ اور فطرت اللہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہی ناموس خلقت ہے، آئینِ طبیعت ہے، آگ کی حرارت اور پانی کی برودت سے بھی زیادہ محکم و غیر مبدل ہے اور صرف عالم حیوانات ہی میں نہیں بلکہ کارخانہ ہستی کے ایک ایک وجود اور ایک ایک ذرّہ تک میں جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ اسی قانون کے ماتحت قوموں کو زندگی ملی ہے اور اسی کے ماتحت وہ ہلاک ہوئی ہیں۔ اور چونکہ قانون دائمی ہیں، اور اعمال یکساں ہیں، طبیعت غیر مبدل ہے۔ خواص لاینفک ہیں اور نتائج و ثمرات ناگزیر۔ اس لیے آئندہ بھی ہمیشہ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور وقت کا امتداد و تغیر اللہ کے قانونِ مکافات و مجازاتِ عمل کو متغیر نہیں کرے گا۔

زہر کھانے سے اگر ایک ہزار برس پہلے آدمی مرجاتا تھا تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب زہر کھانے سے زندگی ملے، اور اگر آگ پانچ ہزار برس پہلے جلاتی تھی تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب اس کے شعلوں میں انگلی ڈالو تو ٹھنڈک اور حرارت ملے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا چنانچہ اسی بنا پر جابجا گزشتہ حوادث و انقلابات کے نتائج کو سُنَّةُ الْاَوَّلِينَ کے لفظ سے تعبیر کیا اور آخرین کے لیے اس کو بطور دلیل و برہان استعمال کیا۔ سورہ انفال میں کہا وَاِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِينَ اور فاطر میں کہا فَهَلْ يَنظُرُونَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِينَ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا اور سورہ نسا میں فرمایا سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ

پس سُنَّةَ اللّٰه سے مقصود یہ قانون نتائج حق و باطل اور آئینِ فلاح و خسرانِ امم ہے نہ مادی و جسمانی خواص کا قانون، جیسا کہ معتزلۂ قدیم و مقلدینِ یونانیات و فلاسفہ اور ان کے خوشہ چینوں نے سمجھا۔ اور جیسا کہ موجودہ عہد کے معتزلۂ جدید اور مفتونینِ فتنۂ علوم جدیدہ نے استدلال کیا ہے۔ ایسا استدلال قطعاً تحریفِ معنوی ہے اور نظمِ قرآن کو بالکل درہم برہم کر دیتا ہے۔

حضرات! آپ کی نظرِ علم و بصیرت سے یہ حقیقت بھی مستور نہ ہوگی کہ قرآن حکیم نے اس ضمن میں جماعتِ انسانی کے وحدتِ اعمال، وحدتِ خواص، اور وحدتِ نتائج کو ایک عجیب معجزانہ استدلال فطری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ البتہ اس کی فقہ و معرفت کا دروازہ صرف انہی قلوبِ صافیہ پر کھل سکتا ہے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انوارِ کتاب و سنت کے اکتساب کے لیے مجلیٰ و مزکی کر دیا ہو اور جنہوں نے ظلماتِ قیل و قال، و آراء رجال و ضلالاتِ مخترعۂ جدل و خلاف، و سُبلِ متفرقۂ یونانیۂ کلامیہ کے طلسماتِ ظنون اور کارخانہ جاتِ اہواء سے نکل کر فضائے بے کنارِ حکمتِ قرآن و سنت کی سیر کی ہو۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ بہرحال قرآن حکیم نے حیاتِ امم کے قانونِ الٰہی کا اعلان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ابتدائے خلقت سے جس طرح حق و ضلالت کا ظہور یکساں

رہا ہے، اسی طرح بطلان و فساد کا ظہور بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ جس طرح حق کی صدائیں ہمیشہ
ایک ہی طرح اٹھی ہیں، اسی طرح ظلم و عدوان کے دعوے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے
ہیں جس طرح حق و ہدایت کی شکل و صورت اور خصائص و اوصاف ہر عہد میں ایک ہی
طرح کے رہے۔ اسی طرح بطلان و فساد کا رنگ روپ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا چنانچہ وہ
جابجا کہتا ہے بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ پھر اس استقرار کے بعد وہ اس
قدرتی یقین و اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جس طرح حق و باطل کی یہ دو زنجیریں متقابل و
متوازی ابتدا سے چلی آتی ہیں ضرور ہے کہ ایک وقت بھی جاری رہیں تاکہ حق کی آخری فتحمندی کا
وقت آجائے اور بطلان و فساد کی تمام سرکش قوتیں مٹ جائیں لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ پس ماضی میں جو
کچھ ہو چکا ہے، مستقبل میں بھی ہوگا اور ماضی میں جو نتائج نکلے ہیں ضرور ہے مستقبل میں بھی
نکلیں، ہمیشہ ایسا ہوگا کہ حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و مظلومی کا معرکہ آویزش و کشاکش گرم
ہوگا۔ حق کا یہ خاصہ طبیعت ہے کہ اس کی غربت و بے چارگی جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر وہ فتح و فوز
سے قریب ہوتا جائے گا اور باطل کا یہ خاصہ طبیعت ہے کہ اس کی قوتِ ظلم و استعداد جس قدر بڑھتی
جائے گی، اتنا ہی وہ ہلاکت و خسران کے لیے زیادہ تیار ہوتا جائے گا۔ حق کی مظلومی میں بالطبع
داعیہ فتح ہے اور ظلم کی سرکشی میں داعیۂ خسران ہے۔ کچھ عرصہ تک کشمکش جاری
رہے گی اور فساد کو تکمیل مادۂ خسران کے لیے، ایک خاص زمانے تک مہلت دی جائے
گی اس مہلت کو قرآنِ حکیم نے جابجا تمتع الی حین اور تربص و استدراج سے تعبیر
کیا ہے اور اس خاص وقت کو جو قانونِ الٰہی کے ماتحت ظہورِ نتائج کے لیے مطلوب ہوتا
ہے، اجل مقدر اور اجل مسمیٰ کہا ہے۔ پس جب وہ وقت آجائے گا اور مادۂ فساد تکمیل
تک پہنچ کر انفجار کے لیے تیار ہو جائے گا تو پھر حق و باطل کا آخری فیصلہ ظہور میں آئے گا
حق کی مظلومی و درماندگی فتح پائے گی، باطل کی مغرور طاقت و سطوت کچھ کام نہ دے گی،
قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اس آخری فیصلہ کا نام قضاء بالحق ہے اور اب لوگوں نے اسے

انتخاب اصلح اور بقائے اشل کے نام سے بھی پکارنا شروع کیا ہے۔ وَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ ھُنَالِکَ الْمُبْطِلُوْنَ ہ

حضرات! اصحاب کہف کو اگر اپنے عہد کے ضلالت و طغیان سے درماندہ و لاچار ہو کر پہاڑ کی غار میں پناہ لینی پڑی، تو گو وہ عہد جا چکا ہے۔ لیکن اس عہد کی ضلالت و طغیان دنیا سے رخصت نہیں ہوئی ہے آج بھی عشاقِ حق کے عزم و ثبات کے لیے ایک ویسی ہی آزمائش درپیش ہے آج بھی ظلم کی حکومت ہے، ابطلان و فساد کی فرمانروائی ہے جور و طغیان کا دور دورہ ہے، اور اصحاب کہف کی بستی کی طرح صرف ایک ہی قطعۂ ارضی نہیں بلکہ تمام کرۂ ارضی کی خشکی و تری حق و عدالت سے محروم ہو گئی ہے۔ اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ بندوں کے لیے کوئی گوشۂ امن و عافیت باقی نہیں رہا ہے۔ گویا زمین کی تمام پچھلی نامرادیاں لوٹ آئی ہیں، اور تاریخ عالم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں۔ سرزمینِ اصحاب کہف کا جبر و طغیان، فراعنۂ مصر کا ظلم و استبداد، نمارۂ کلدان کا غرور و تمرد، اصحاب مدین کا انکار و اعراض، قوم عاد کا فسق و عدوان یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ مصر و ایران، بابل و نینوا، یونان و روما اگرچہ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کی صداقت کے مقابلہ کے لیے اٹھ چکے ہیں، لیکن اب ان سب کی جگہ اور ان سب سے بڑھ کر یورپ کی مدنیتِ ملعونہ ہے جو پانچ سال تک آگ اور خون کے سیلابوں میں غرق رہ کر بھی بدستور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً کا دعویٰ کر رہی ہے۔ اصحاب کہف کی جماعت چند انفاس پر مشتمل تھی۔ اس لیے پہاڑ کی غار میں انہیں پناہ مل گئی۔ لیکن آج اصحاب کہف کی سی مظلومی میں چند افراد ہی نہیں بلکہ آبادیوں کی آبادیاں اور اقلیموں کی اقلیمیں مبتلا ہو گئی ہیں اور لاکھوں کروڑوں بندگانِ الٰہی پر ان کی بستیوں اور شہروں میں امن آزادی کا دروازہ بند ہو گیا ہے اس لیے نہ تو صحراؤں کے اس قدر گوشے ہیں جہاں انہیں پناہ مل سکے اور نہ پہاڑوں کی اس قدر غاریں ہیں جو انہیں

اپنے آغوش میں لے سکیں۔

حضرات! آیئے قبل اس کے کہ ہم صفِ ماتم میں بیٹھیں، ذرا اپنی اُن بربادیوں پر بھی ایک نظر ڈالیں جن کے ماتم و فغاں سنجی کے لیئے آج یہاں جمع ہوئے ہیں تمام کرۂ ارضی کے مشارق و مغارب پر نظر ڈالیے اور ڈھونڈیے کہ پرستانِ حق و اسلام کے لیے کوئی ایک گوشۂ امن بھی آج باقی رہا ہے! سانپوں کے بھٹ ہیں اور درندوں کیلئے غار ہیں جہاں امن و بے فکری سے وہ اپنی رات بسر کر سکتے ہیں۔ مگر آہ! پیروانِ اسلام کیلئے آج تمام کرۂ ارضی میں چار بالشت زمین بھی امن و عافیت کی باقی نہیں رہی۔ گویا اسلام کی پوری تیرہ صدیوں کی تاریخ ایک محض افسانۂ ماضی اور حکایتِ دفینہ ہے۔ اوراق و دفاتر میں پڑھی جا سکتی ہے۔ مگر بلاد و اقلیم میں دیکھی نہیں جا سکتی۔ حضرات! معلوم نہیں کہ آپ کے کانوں کا کیا حال ہے مگر میں اپنے نامراد سامعہ کو کیا کروں جس سے ہر لمحہ اور ہر آن وا شریعتا! وا دنیا کی جگہ دوز صدائیں ٹکرا رہی ہیں۔ اور میری مجروح آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کفر و ظلم کے غلبہ و قہر سے ارضِ الٰہی کا ایک ایک چپہ چیخ رہا ہے، پرستارانِ حق کی غربت و بیکسی ہر طرف سر پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہی ہے اور فضائے کائنات کا ایک ایک ذرہ قائمِ حق کو ڈھونڈ رہا ہے حامیانِ ملت کو پکار رہا ہے۔

یا ناعی الاسلام قم فانعہ

قد زال عرف و بدا المنکر

حضرات! یہ دعا اصحابِ کہف نے اُس وقت مانگی تھی جب اُن کی آبادی کے دروازے اُن پر بند ہو گئے تھے۔ آیئے آج ہم اسی دعا کو وسیلۂ قبولیت بنائیں جب کہ صرف ایک ہی آبادی کے نہیں بلکہ تمام دنیا کے دروازے پیروانِ حق پر بند ہو گئے ہیں۔ اور ہر طرف ظلم و فساد کی حکومت پھیل گئی ہے۔ اس دعا میں رحمتِ الٰہی کی طلب ہے اور ارشاد امر کا سوال ہے۔ رحمت، اللہ کی وہ صفتِ کاملہ ہے جو ہر طرح کے فیضان و بخشائش کا

دروازہ کائنات ہستی پر کھولتی ہے اور رشد امر سے مقصود ہر طرح کی ہدایت و رہنمائی ہے جو حصولِ مقاصد کے لئے مطلوب ہو پس گویا اعجازِ بلاغتِ قرآنی نے ان چند لفظوں کے اندر ان تمام برکات و مقاصد کو جمع کر دیا ہے جن کی نوعِ انسانی محتاج ہو سکتی ہے۔ اس کو رحمت کی ضرورت ہے جو اس کی درماندگیوں اور خطاؤں کو بخش دے اور رشدِ امر کی ضرورت ہے تاکہ صحیح راہِ کامیابی پر چل کر کامران و فتحمند ہو۔ ان دونوں ہی چیزوں کے ہم بھی محتاج و آرزومند ہیں۔ ہم نے خطائیں کی ہیں۔ پس اس کی رحمت مطلوب ہے جو بخش دے۔ ہم نے راہِ عمل گم کر دی ہے اور رشد و ہدایت کے سائل ہیں تاکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔

حضرات! اب میں جمعیۃ العلماء کے وجود و مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس سلسلہ میں دو اہم مطالب سامنے آتے ہیں۔ ایک جمعیۃ العلماء کے مقاصد و وظائف کا مبحث ہے جو اس وقت تک مسائلِ وقت کے انہماک کی وجہ سے بحث و نظر میں نہ آسکا۔ دوسرا موضوع مسائلِ حاضرہ کا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آرائشِ بیان و تزئینِ عبارت سے بکلی قطع نظر کر کے نفسِ مطالب بطریقِ اشارات گوش گزار کر دوں۔ حضرات! جمعیۃ العلماء کا قیام فی الحقیقت مسئلہ "احیاء و تجدیدِ ملت" کی ایک فرع ہے جو گذشتہ ایک صدی سے تمام عالمِ اسلامی میں دعاۃِ اصلاح و ترقی کے لیے مبحثِ افکار و معرکۂ آراء و انظار رہ چکا ہے۔ مسئلہ احیاءِ ملت کا مقصود واضح ہے یعنی مسلمانوں کو موجودہ پستی و ادبار سے نکالنے اور ان کے عز و اقبالِ رفتہ کے واپس لانے کے لئے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہئیں اور راہِ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ابتدا سے تین مختلف مذاہبِ اصلاح ہیں۔ جو ہندوستان، مصر، ٹرکی، ایران، ٹیونس اور بلادِ ترکستان و قفقاز کے درمیان اصلاح نے اختیار کئے ہیں۔

پہلا مذہب وہ ہے جسے میں "اصلاحِ افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں۔ گذشتہ صدی

یورپ کے تمدن و صنائع کے ظہور و اعلان کا عہد تھا۔ یورپ کی پستی نہایت تیزی کے ساتھ بلند ہو رہی تھی اور مشرق کی بلندی موجودہ پستی کی طرف اُسی تیزی کے ساتھ گر رہی تھی۔ جب یورپ کے تمدن کا ہوش ربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا تو دو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مرتب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت و جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اُٹھائی لیکن ایک جماعت ارباب بینش و خبر کی بھی تھی جس نے فوراً تغیر احوال محسوس کیا۔ لیکن جیسا کہ طبیعت بشری کا خاصہ ہے، اپنی پستی و کمزوری اور جلوہ کی نظر فریبی و ہوش ربائی کی وجہ سے یہ اول نظر مرعوب و مسحور ہو گئی اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں سر سید احمد خاں مرحوم اور اُن کے متبعین و مقلدین، ٹرکی میں سلطان محمود خاں اور اس کے عہد کے وزراء مثلاً فواد پاشا، مصر میں محمد علی پاشا، ٹیونس میں خیر الدین صاحب "اقوم المسالک" اور بیرم تونسی صاحب "صفوۃ الاخبار" وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔ اُنہوں نے اصلاح و تغیر کے لیے صرف یورپ کی تقلید، علوم مدنیہ کی ترویج، عادات و خصائل فرنگ کے تخلق و تشبہ اور اُن کے ذہنی و عملی تعبد و اطاعت کو ہی اساس کار و اعتقاد اصلاح قرار دیا۔

دوسرا مذہب "اصلاح سیاسی" کا مذہب ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس کو اسلامی ممالک کے پولیٹیکل زوال اور سیاسی اختلال کا حد درجہ استغراق ہوا اس لیے اس کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے جب تک یہ ظہور پذیر نہ ہو کوئی سعی سودمند نہیں ہو سکتی۔ ممالک اسلامیہ میں اس مذہب اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی تھے اور ٹرکی میں مدحت پاشا ابو الاحرار کی دعوت بھی اسی مسلک میں محسوب ہے۔

تیسرا مذہب اصلاح "اصلاح دینی و اسلامی" کا ہے۔ اگرچہ مذہب کے دعاۃ بمقابلہ مذاہب سابقہ قلیل رہے مگر فی الحقیقت مسئلہ اصلاح میں بھی گروہ اصحاب

رشد و ہدایت اور سالکین جادہ اقتصاد و حق کا رہا ہے۔ بحکم حدیث "قلیل فی ناس سوء کثیر" (رواہ ابو داؤد) گو ان کی تعداد قلیل اور اُن کی صدائیں ضعیف رہیں لیکن زمانہ روز بروز اُن کی دعوت سے قریب تر ہوتا گیا اور مذاہب سابقہ کی نامرادیوں نے بہت جلد اس مسلک کی صحت و حقانیت دنیائے اسلام پر آشکارا کر دی۔

اس آخری مسلک اصلاح کی بنیاد حسب ذیل مبادی و مقدمات پر تھی اور ان ہی کی دعوت و تبلیغ کے لیے ۱۹۱۲ء میں میں نے الہلال جاری کیا تھا۔

۱۔ اسلام کے نظمہ شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اسلام نے شریعت الٰہی کو نوع انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا ؟ وسرچشمہ قرار دیا اور مسلمانوں کی سیاسی، علمی، اخلاقی، قومی، تمدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقت جامعہ پر ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ اور کتاب و سنت پر۔

۲۔ مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انہیں تبلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں، وہی خیر الامم ہیں، وہی خیر الرجہ ہیں، وہی شہداء علی الناس ہیں، وہی شہداء اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن حکیم اور سنت رسول کو انہوں نے اپنا دستور العمل حیات قرار دیا تھا۔ قرآن کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا: "ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین" (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائے گا۔ اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گریں گی اور ہلاک ہونگی پس جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کا علم و عمل ترک کر دیا تو اقبال و عروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔ یہ مسلمات حقائق تاریخیہ میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا سب سے بہتر اور ارفع زمانہ وہی تھا۔ جب بجز کتاب و سنت کے علم و عمل کے اور کوئی تعلیم انکی رہنما نہ تھی۔ یعنی عہد صحابہ کرام و خلفائے راشدین۔ اور تنزل و فساد کا عہد

اس وقت سے شروع ہوا کہ جب اقوام ماضیۂ مغضوبہ کے علوم و اعمال لشکلِ علوم خیلہ و اعمالِ بدعیہ اُن میں رائج ہوئے۔ ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے۔ پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروجِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں تو صرف ایک ہی راہ ہے اس کے علاوہ جس قدر راہیں بھی نکلیں گی، گمراہی و فساد کی ہوں گی۔ یعنی علم و عملِ شریعت کا احیا اور ترک و ہجرِ شریعت کا انسداد۔

۳۔ اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعتِ اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ اور اُس کا وعدہ ہے۔ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ۔ یقیناً اس وعدہ کا ابھی ظہور نہیں ہوا پس ضرور ہے کہ وعدۂ الٰہی ظاہر ہو اور اس بنائے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ نوز فتح ہو سکتی تو وہ صرف دعوتِ شریعت اور احیاءِ عمل بالقرآن ہی ہے۔

۴۔ مسلمانوں سے اہتدا و اتباعِ شریعت مہجور نہیں ہوا مگر علماء اسلام کی غفلت و اغراض سے۔ شریعت کے علم و عمل کے وہی حامل و مبلغ تھے اور امت کی حیاتِ شرعیہ کا تمام دار و مدار خود ان کی حیاتِ علمی و عملی پر تھا۔ جب کتاب و سنت کا ترک و ہجر تفرقہ و تشتتِ وحدت اور سبلِ متفرقہ کا شیوع۔ اختلاف و تحزب کی عصبیت، علومِ محدثہ کا استغراق، حبِ جاہ و ریاست کا استیلا، فریضۂ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تغافل، اہوا و سلاطین و امرا کا اتباع، اجتہاد و فکر و نظر کا فقدان غرض کہ منصبِ نیابتِ نبوت کا ضیاع اور احبار و رہبانِ اہلِ کتاب کے تذکرۂ قرآن مقاصد کا ظہور و احاطہ خود طبقۂ علما میں بحدِ کمال پونچ گیا تو اس کا لازمی نتیجہ امت کی ہلاکت تھا اور وہ ظہور میں آیا۔ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا

پس اب اگر اصلاحِ حال کی کوئی راہ ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ علمائے امت کے طبقہ میں احساسِ حال کی تبدیلی پیدا ہو اور وہ اپنے منصبِ عظیم کو ازسرِ نو سنبھال لینے

کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اس طرح علم و عمل شریعت کا احیا صورت پذیر ہو۔ ترکستان و بلاد روسیہ میں شیخ صدرالدین، مصر میں شیخ محمد عبدہٗ، شام میں شیخ عبدالرحمٰن کواکبی اور شیخ کمال الدین قاسمی وغیرہم اسی مسلکِ اصلاح کے داعی تھے مگر سلطان عبدالحمید مرحوم کے استبداد نے مہلتِ عمل نہ دی اور ان کے افکار نفاذِ عمل تک نہ پہنچ سکے۔

ان تین جماعتوں کے علاوہ ایک چوتھی جماعت بھی ہمیشہ رہی ہے اور اب بھی موجود ہے۔ لیکن اس جماعت کا کوئی ایجابی مسلک نہیں ہے محض سلبی وجود ہے۔ یعنی اربابِ جمود و غفلت کا طبقہ۔ اس جماعت کو اصلاح سے انکار ہے۔ اور ضرورتِ سعی و انقلاب سے گریز۔ اور پھر ان ہی میں وہ دعاۃِ فتن، علمائے سوء و مشائخ دنیا و دجاجلۂ فساد بھی ہیں۔ جو ہر صدائے حق کے جحود اور ہر سعی اصلاح و عمل کے انکار و مقاومت کو اپنا فریضۂ علم و عمل سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ الحمدللہ اب ان کی کوئی منظم ہستی باقی نہیں رہی ہے۔

حضرات! اس مسلکِ اصلاح کے مطابق ممالکِ اسلامیہ میں متعدد کوششیں علماء کے اجتماع و نہضت کے لیے کی گئیں۔ شیخ محمد عبدہٗ نے اپنے تمام آخری ایامِ حیات علمائے ازہر کے انتباہ و بیداری میں صرف کر دیئے۔ الشیخ محمد عزائری نے علمائے جامعہ زیتونیہ ٹیونس کی ایک جمعیۃ اصلاح قائم کرنے کے لیے مدت العمر آہ و فغاں کیا۔ الشیخ عبدالرحمن کواکبی نے "سجل جمعیۃ ام القریٰ" لکھ کر علمائے اسلام کی بین الملی جمعیت کی تحریک کی۔ ہندوستان میں پہلے ندوۃ العلماء اور پھر جمعیۃ الانصار دیوبند قائم ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی سعی و تدبیر بھی سودمند و کامیاب نہ ہوئی۔ اس ناکامیابی کے بھی واضح و بیّن اسباب ہیں۔ لیکن میں بخیالِ اختصار ان کی تشریح نہیں کروں گا۔ بعض مساعی کیلئے استبدادِ حکومت مانع ہوا۔ بعض مساعی باہمدگر اختلافات و نزاعات کی وجہ سے ناکام رہیں بعض تدابیر میں علماء سوء و دعاۃِ فتن کی مقاومت نے خلل ڈالا۔ اور اکثر کا یہ حال رہا کہ خود نفسِ دعوت و تدبیر کے اندرونی نقائص کامیابی میں حائل ہو گئے۔ از انجملہ سب سے

بڑا نقص ان تمام دعوتوں میں یہ رہا کہ گو اصلاً اصلاح دینی کی قسم میں داخل تھیں لیکن بمصداق خلطوا عملاً صالحاً وّاٰخر سیئاً جو طریق عمل اختیار کیا گیا تھا وہ ٹھیک ٹھیک نہج قویم و مستقیم پر نہ تھا۔ یعنی منہاج و اسوۂ نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہ تھا، اور کتاب و سنت کی دعوتِ خالص و بے آمیزش کی جگہ موجودہ عہد کے طرق محدثہ نے ان میں راہ پالی تھی۔ اور از اں جملہ ایک بڑا سبب اُن کی ناکامی کا یہ بھی ہوا کہ اصول کی جگہ فروع کا استغراق داعیوں پر چھا گیا اور یہ حقیقت اُن پر منکشف نہ ہوئی کہ راہ کی ہدایت کا تعین کیونکر کرنا چاہیئے۔ پس ایسا ہوا کہ جو طاقت اصل پر خرچ کرنی تھی وہ بعض شاخوں کیلئے وقف ہوگئی۔ مثلاً اصلاح نصابِ تعلیم وغیرہ۔ اور اس طرح تمام کارخانۂ دعوت درہم برہم ہوگیا۔ مع ہذا اس کارخانۂ حیات اور کارگاہِ مکافات و مجازات کا کوئی عمل بھی ایسا ضائع نہیں جاتا جس کی بنیاد اعتقادِ صحیح پر ہو۔ یہ کوششیں اگرچہ خود راہ نہ پا سکیں لیکن انہوں نے آنے والے عہد کیلئے بہت کچھ راہ صاف کردی۔ اور کم از کم ان میں سے ہر سعی کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ دعوتِ اصلاح دینی اور حرکت و نہضۂ علمائے ملت کے لیے وقت کی استعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

حضرات! مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خود ستائی اور نخوت و فروشی کا الزام نہ دیں گے اگر میں بطور تحدیث نعمت اس موقع پر دعوتِ الہلال کا بھی ذکر کروں۔ عالم اسلامی کے ماضی قریب میں اصلاح دینی اور انتباہ و انبعاث علماء ملت اور احیاء و تجدید اُمت کی جو دعوت ان تمام پچھلی دعوتوں کے طریقوں اور اسلوبوں سے بالکل مختلف اسلوب پر بلند ہوئی ہے وہ دعوتِ الہلال ہے آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمیعت العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں میں ۱۹۱۲ء سے مسلسل "وا اسفا علی یوسف" کی فغاں سنجی کر رہا ہوں۔ اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشم خونین کے آنسوؤں

بے رنگ ہے اور کبھی اس کے سواد و حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ ۱۳۳۱ھ سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو۔ اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گذری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بستر غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظربندی و قید کے سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے۔

پس اے بزرگانِ ملت! اگر آج علماء امت کی یہ نہضت مبارکہ جمعیت العلماء کی شکل میں طالع نظرافروز ہوئی تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ میرے دہ سالہ سوالوں کا جواب ہے، میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے، میری فریادوں اور التجاؤں کی قبولیت ہے، میرے لیے ما تشتھیہ الانفس و تلذ الاعین ہے اور یقیناً میری امیدوں کے خواب قدیم کی تعبیر ہے۔

حضرات! جمعیت العلماء کا قیام دراصل اسی آخری مذہب اصلاح و احیا کا ظہور ہے اور اس کی تاسیس حضرت امام مالک کے اس اعتقادی قاعدہ پر ہوئی ہے "لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" اس امت کے آخری دور کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوگی جس سے ابتدائی عہد کی ہوئی تھی۔ اور یہ قاعدہ ٹھیک حضرت صادق کی اُس خبر کے مطابق ہے جو مشہور حدیث غربیہ میں دی گئی ہے "بدء الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ" (رواہ مسلم) اسلام کے لیے دو عہد غربت ہیں۔ ایک غربت اولیٰ اور ایک ثانیہ۔ پس ضرور ہے کہ جو کچھ غربت اولیٰ میں ہوا غربت ثانیہ میں بھی ہو۔ اور جس چیز نے غربت اولیٰ کو فتح و اقبال اول سے بدل دیا، وہی چیز اس غربت ثانیہ کو فتح و اقبالِ ثانی سے بدل دے۔ اور وہ نہیں ہے مگر دعوتِ صادقہ د

مصالحہ کتاب وسنت اور احیائے علم وشریعت ہے

مصلحت دید من آن ست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند وخم طرۂ یارے گیرند

چنانچہ اسی حدیثِ غربت میں اس کی تصریح بھی موجود ہے " فطوبیٰ للغرباء وھو الذین یصلحون ما افسد الناس من سنتی " (رواہ ترمذی) سبحان اللہ غربائے دورِ آخر کی خوش نصیبی اور مصلحینِ غربتِ ثانیہ کی بلند طالعی! کہ زبانِ حق ترجمان نبوت بسان کے لیے مبارک نکلی۔

حضرات! یقیناً میں نے یہ عرض کرنے میں آپ تمام مجمعِ علم وبصیرت کے آراء و معتقدات کی ترجمانی کی ہے کہ جمعیت العلماء کے اعمال دعوت کے لیے قاعدہ اساسی یہی مسلک ہے، اسی مقصد کو سامنے رکھ کر وہ موجودہ عہدِ غربت اسلام میں منصب نیابت وشہادتِ حق کے فرائض انجام دینے کے لیے مستعد کار ہوئی ہے۔ اور بلاخوف رد کہا جا سکتا ہے کہ مسلک اصلاحِ دینی کی بنا پر عالمِ اسلامی کا یہ سب سے پہلا اجتماع علماء ہے جو اس وسعت و اتحاد اور جمعیت دقوام کے ساتھ مجتمع ہوا ہے۔ جو کام اس وقت تک تمام بلادِ اسلامیہ کی طلب وسعی سے بروئے کار نہ آسکا اور جس کی توفیق موجودہ عہد کی اسلامی حکومتوں کو بھی نہ ملی اور تمام مصلحینِ عہد اس کی تمنائیں اپنے ساتھ لے گئے۔ آج وہ اپنی سعی ہمت فعل و وجود تک پہنچ چکا ہے اور عمل واقدام کی شاہراہ آپ کے آگے باز ہے۔

حضرات! اس اصل تقریر کے بعد ضرورت تھی کہ جماعت علماء کے منصب و وظائف کی بھی پورے شرح وبسط کے ساتھ تفصیل کر دی جاتی۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ طلب صلاح اور ادائے فرض کے سلسلے میں آج جو مقصد آپ کے سامنے آیا ہے وہ کوئی نیا مقصد نہیں ہے بلکہ وہی مقصدِ اصلی وقدیمی ہے جو روزِ ازل سے وحی الٰہی نے جماعتِ علماء کیلئے قرار دے دیا ہے اس مقام پر سب سے زیادہ اہم منصبِ علم حق کی شہادت و دعوت کا تھا

جہاں پہنچ کر ہم معلوم کرتے کہ حکمتِ الٰہی نے کائناتِ ہستی اور نوعِ انسانی کے قیام و سعادت کے لیے کونسا نظامِ ہدایت مقرر کیا ہے اور قرآن حکیم کے بیانات اس بارے میں کیا ہیں؟ قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ دنیا کی قوامِ سعادت کی بنیاد تین حقیقتوں پر ہے جن کو اصطلاحِ قرآنی میں لفظِ "شہادت" سے تعبیر کیا ہے۔ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران) اس آیہ کریمہ میں بالترتیب تین شہادتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ کی شہادت، ملائکہ کی شہادت، اولو العلم یعنی علم والوں کی شہادت۔ قرآنِ حکیم جب کبھی لفظِ شہادت کو اس سیاق و سباق کے ساتھ استعمال کرتا ہے جیسا کہ یہاں ہے، تو شہادت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ کے کلمۂ حق کی اس کی زمین پر گواہی دینا یعنی اس کا اعلان و اظہار کرنا۔ ہدایتِ الٰہی کی دعوت کو قائم کر دینا اور حق و صداقت کی تعلیم و بیان سے دنیا کی غفلت و ضلالت کا استیصال کرنا۔ پس وہ تمام امور جو بیان، اظہار، اعلان، تعلیم، دعوت اور قیام و قوامِ دعوت سے تعلق رکھتے ہیں سب کے سب لفظِ شہادت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ پس آیہ آلِ عمران میں شہادت سے مقصود شہادتِ حق و توحید ہے۔ خواہ زبانِ قال سے خواہ حال سے۔

اللہ کی شہادت سے مقصود صدا و حی میں اُسکی وحی ہے اور مشاہدہ و احوال میں کائناتِ ہستی کا نظام و جمال ہے۔ یہ آخری شہادت دنیا کے گوشے گوشے، چپے چپے، ذرے ذرے سے ہر آن و ہر لحظہ بلند ہو رہی ہے۔ ہر سامعۂ معرفت سنتا ہے اور ہر چشمِ عرفان اس کا مشاہدہ کرتی ہے

ملائکہ کی شہادت اِس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ وحی الٰہی کے سفیر و وسیط ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ کارگاہِ ہستی کے تمام تغیرات و شئون کی اصلی علت انہی کے اعمال مدبرہ ہیں۔ اگرچہ ہمارا علم محدود محسوس نہ کر سکے۔ یہ ملائکہ سماویہ ارضیہ ہی کی شہادت ہے جو تمام تغیراتِ کونیہ کے اندر فاطر السموات والارض کی قدرت و حکمت کا اعلان کر رہی ہے

مشہد و منظر تو میدانِ شہادت ہے جہاں انہوں نے صرف اپنی زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے خون شہادت کی سُرخی سے حق و صداقت کے نقوش ہمیشہ کیلئے صفحۂ عالم پر ثبت کر دیے ہیں۔

پھر اس کے بعد مجھے بالتفصیل عرض کرنا تھا کہ وہ کیا اسباب و بواعث ہیں جن کی وجہ سے اس شہادت کے قیام و اجرا میں خلل پڑا یعنی مسلمانوں کے تنزل عام و عمل کے مبادی و اساسات کیا ہیں۔ کیونکہ جب تک امراض کی صحیح تشخیص نہ ہوگی، علاج صحیح کی راہ نہیں کھل سکتی اس سلسلہ میں مفاسد و مہالک کے اصول بھی تھے اور فروع بھی تھے۔ مبانی و مبادیات تھے اور اُن کا شیوع و انشعاب تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے سب کو شمار کرنا تھا۔ اصل اس بارے میں وہ مفاسد و فتن ہیں جو ہمیشہ اقوام و شرائع کی ضلالت و فساد کا باعث رہ چکے ہیں اور اسلئے قرآن و سنت نے اول دن ہی اُن سب کی توضیع و تشریح کر دی تھی۔

ازاں جملہ وہ مفاسد ہیں جن کا حال امم سابقہ علی الخصوص اہل کتاب کے اسباب ضلالت کی حکایت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے جا بجا بیان کیا ہے۔ اور مقصود ان سے امت مرحومہ کا تنبہ و اعتبار ہے —— اور ازاں جملہ فتنہ شبہات و شہوات ہے جس کی خبر حدیث عائشہ عند الصحیحین وغیرہما میں دی گئی۔ "شبہات" میں تمام ذہنی و اعتقادی مفاسد آگئے اور "شہوات" میں تمام عملی مفاسد —— اور ازاں جملہ فتنۂ تفرقہ و اختلاف ہے جس کے اخبار و دلائل مملو ہیں —— اور ازاں جملہ فتنہ تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین ہے جس کی خبر حدیث ابراہیم بن العذری عند بیہقی میں دی گئی تھی اور جس کے تین جملوں میں سارے فتنے گن دیے ہیں —— اور ازاں جملہ فتنۂ جدل و فتنہ تعمق و تنطع اور فتنہ غلو ہے۔ جن کے اخبار کو حضرت امام بخاری نے باب الاعتصام بالسنۃ میں "ایک عجیب و دقیق ترتیب حکیمانہ و استنباط فقیہانہ کے ساتھ جمع کیا ہے —— اور ازاں جملہ فتنہ مولدین و ذخلاء ہے جس کی خبر حدیث ابن ماجہ میں دی گئی تھی کہ "لم یزل امر بنی اسرائیل معتدلاً حتی نشاء فیھم المولدون" —— اور ازاں جملہ فتنہ تولید "وھن" اور ترک

اعلان سے مجھ کو جھڑا ردکا جارہا ہے کہ طلاقِ مکرہ کوئی چیز نہیں۔

آپ امامِ اہلِ سنت حضرت امام احمد بن حنبل کو دیکھئے کہ معتصم باللہ جیسا قاہر و باجبروت فرمانروا اُن کے سامنے کھڑا ہے۔ جلاد یکے بعد دیگرے تازیانے لگاتے ہیں پیٹھ زخموں سے چور چور ہو گئی ہے۔ تمام جسم خون سے رنگین ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ محض اس لیئے ہو رہا ہے کہ جس مسئلہ کو وہ کتاب وسنت کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا ایک مرتبہ اقرار کرلیں۔ لیکن اس پیکرِ حق، اس مجسمۂ سنت، اس سایۂ اعظم کی زبانِ صدق ترجمان سے یہی صدا نکل رہی ہے۔ اعطونی شیئًا من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

آپ حضرت امامنا الاعظم امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھیے کہ قید خانہ بغداد میں اسیر ہیں۔ لیکن اس پر بھی منصور عباسی جیسے قاہر بادشاہ کے حکم کے سامنے اُن کا سر نہیں جھکتا۔۔۔ آپ کو حضرت امام شافعی اس حالت میں نظر آئے کہ یمن سے بغداد تک قید و اسر کی حالت میں بھیجے جا رہے ہیں اور اُن کا جرم صرف یہ ہے کہ حق کے داعی ہیں اور صدق و ہدایت پر قائم ہیں۔۔۔ آپ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ کو دیکھیے کہ تین تین مرتبہ مصر کے قید خانے میں اسیر کیے گئے اور بالآخر قید خانے ہی میں وفات پائی مگر اظہارِ حق سے منہ نہ موڑا اور حکومتِ وقت کے آگے سرِ اطاعت خم نہ کیا۔۔۔ آپ خود اسی ہندوستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو دیکھیئے کہ قلعہ گوالیار میں قید ہیں۔ مگر جہانگیر کے آگے اس سر کو جھکانے کیلیئے تیار نہیں، جس کو اللہ نے صرف اپنے ہی آگے جھکنے کے لیئے بنایا ہے۔۔۔ آج ہندوستان میں صرف قید و بندی کی منزل ہمارے سامنے آئی ہے اسلیئے میں صرف انہی کا ذکر کر رہا ہوں جنھوں نے راہِ دعوتِ حق میں اس منزل کو مردانہ وار طے کیا۔ ورنہ علمائے حق کی شہادتِ حق اور ادائے فرضِ نیابتِ نبوت کا سب سے بڑا

سکتی۔ جن سے علمائے اسلام کی تاریخ کا ہر باب و صفحہ روشن ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ دہشت اور انسانی تاج و تخت کی کوئی ہیبت و سطوت بھی علمائے اسلام کے جذبۂ اعلانِ حق پر غالب نہ آسکی۔ اور دنیاوی خوف و طمع کا کوئی مظہر بھی انہیں اس راہ سے باز نہ رکھ سکا دنیا میں راہِ حق سے روکنے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں، اور ساری آزمائشیں انہی میں منحصر ہیں۔ ایک خوف ہے۔ ایک طمع۔ لیکن ان کے دلوں میں خوف تھا تو صرف اللہ کے جبروت و جلال کا۔ اور طمع تھی تو صرف اسی کی رضا و رحمت کی یدعون ربھم خوفا وطمعا پس نہ تو خوف کا حربہ ڈرا سکتا تھا اور نہ طمع کی دلفریبی انکے دل کو لبھا سکتی تھی۔

حضرات! وقت تھا کہ اسی سلسلہ میں میں آپ کو علمائے اسلام کے ادائے فرض کے چند مناظر دکھلاتا۔ آپ حضرت سید التابعین سعید بن المسیب کو دیکھئے کہ حکام جور کے حکم سے اُن کی پیٹھ پر دُرّے لگائے جا رہے ہیں مگر انکی زبان صدق بیان اعلانِ حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہوگئی ہے۔ آپ مدینہ کی گلیوں میں امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس کو دیکھیے۔ اُن کی مشکیں اس زور سے کس دی گئی ہیں کہ دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں اور اوپر سے پیہم تازیانے کی ضربیں پڑ رہی ہیں اس عالم میں بھی جب زبان کھلتی ہے تو اسی مسئلہ کا اعلان کرتے ہیں جس کو وہ حق سمجھتے تھے۔ لیکن وقت کی حکومت اُسکے اعلان کو اپنے جبر و طاقت سے روکنا چاہتی تھی یعنی مسئلہ طلاق مکرہ کو جب گورنر مدینہ نے تشہیر و تذلیل کے لیے اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر سوار کرا کے گشت کرایا تو ان کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی بازار یا مجمع سامنے آتا تو عین ضربِ تازیانہ کی حالت میں کھڑے ہو جاتے اور پکار کر کہتے۔

من عرفنی فقد عرفنی ومن	جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو
لم یعرفنی فانا مالک ابن انس	نہیں جانتا تو جان لے کہ میں ہوں مالک
اقول طلاق المکرہ لیس بشئ	انس کا بیٹا اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں کہ

وَلٰکِن لَا یَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعَالِمُوۡن

تیسری شہادت اولو العلم یعنی علم والوں کی ہے۔ جب شہادت الٰہی کی ابدی و سرمدی نداؤں اور ملکوت السمٰوات والارض کی غفلت شکن صداؤں سے غافل انسان اپنے کان بند کر لیتا ہے تو پھر ایک تیسری شہادت کی ضرورت ہوتی ہے جو خود انسان ہی کے اندر سے اٹھے۔ وہ شہادتِ الٰہی کی حامل و مبلغ ہو اور شہادتِ ملائکہ کے ادراک و معرفت کی راہیں کھولنے والی ہو۔ پس یہ تیسری شہادت اصحابِ علم و معرفت کی شہادت ہے۔ اصل اور اساسی طبقہ اس جماعت کا انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور پھر تبعًا انکے متبعینِ صادقین یعنی علماء و عرفائے حق ہیں، جو ہمیشہ نوعِ انسانی کی غفلتوں اور ضلالتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کی زمین کو اس کے کلمۂ صدق و حق کی شہادت سے خالی ہونے نہیں دیتے۔ چنانچہ شاہدینِ حق کی یہ جماعت ابتدائے ظہورِ ہدایت سے برابر رہی اور جب تکمیل شریعت کا وقت آ گیا، اور اتمام نعمت کی وجہ سے حضرات خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم کا ظہور ہوا تو اس شہادتِ الٰہی کا منصب بھی قیامت تک کیلئے انہی کے سپرد ہوگا۔ اور علمائے اسلام انکے وارث و نائب ٹھہرے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا نیز فرمایا اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا یعنی حق و ہدایت کی جو شہادت اس شاہد صادق نے امتِ مرحومہ کو پہنچائی ہے۔ امتِ مرحومہ تمام نوعِ انسانی اور کرۂ ارضی میں اس کے اعلان و قیام کی ذمہ دار ٹھہری۔ تاکہ جو روشنی اس سراجِ منیر سے حاصل کی ہے اس سے تمام ارضِ الٰہی کو روشن کر دے۔

پھر اس کے بعد واضح کرنا تھا کہ علمائے اسلام نے گذشتہ تیرہ صدیوں کے اندر کس طرح اس فرضِ شہادت کو انجام دیا ہے۔ اور دعوت و اعلانِ حق کی راہ میں کیسی کیسی قربانیاں اور سرفروشیاں کی ہیں۔ دنیا میں کسی قوم کی تاریخ حق پرستی کی ایسی مثالیں نہیں دکھلا

جہاد فی سبیل اللہ ہے اور "وھن" کے معنی تبلا دیے تھے کہ حب الدنیا وکراہۃ الموت"
پھر ان مفاسد اصلیہ کے فروع اور برگ و بار ہیں۔ ضرور تھا کہ انکی بھی تشریح کی جاتی مثلاً نظام و قوام خلافت کی برہمی، تفرقہ دینی و مناصب، حکومت شوریٰ کی جگہ حکومت شخصیہ و مستبدہ کا قیام۔ وحدت کلمۂ اسلام کی جگہ تفرقۂ مذہب و احزاب کہ فی الحقیقت راس الفتن اور علت العلل انقراض ملت یہی ہے۔ اسی طرح ترکِ اہتداء بہ کتاب و سنت کی جگہ علوم محدثہ و دخیلہ کا استغراق اور شیوع۔ فتنۂ یونانیہ و عجمیہ کا ظہور کہ فتنۂ شبہات اور فتنۂ مولدین میں انہی دو سب سے بڑے فتنوں کی خبر دی گئی تھی۔ اور ازاں جملہ علماء میں اصحابِ مناصب و ریاست کی کثرت کہ بقول امام غزالی سب سے بڑا سبب علماء دنیا کی کثرت اور علماء آخرت کی قلت کا یہی ہوا۔ دقالی تی الدجیل او ر ازاں جملہ اقوام مغضوبہ و ضالہ کی موالات کا شیوع و استیلا جس سے کتاب و سنت میں بار بار روکا گیا تھا اور صحابہ کرام اس فتنہ سے تعوذ کیا کرتے تھے ——— اور ازاں جملہ خلافتِ عربیہ کا انقراض و عجمی حکومتوں کا قیام اور مرکزیت و وحدت خلافت کا فقدان، بالآخر تمام اسلامی حکومتوں کا زوال، علماء کا محکومیت و غلامی پر اقناع، فریضۂ جہاد و دفاع فی سبیل اللہ سے اعراض، ادائے فرض و وظائف شرعیہ میں طرح طرح کے حیل و احیال اور اسی طرح کے بے شمار فرعی مفاسد تھے جن کا افسانۂ درد آپ کے سامنے دہرانا تھا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد اُن طرق اصلاح پر نظر ڈالنی تھی جو گذشتہ صدی میں عالم اسلامی کے تمام داعیانِ اصلاح نے اختیار کی ہیں اور پھر خاص ہندوستان کی سابق اور موجودہ حالت اور اس کی مقتضیات و داعیات پر بحث کرنی تھی۔ اس طرح واضح ہوتا کہ ہمارے لیے آئندہ مسلکِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اور اس کے ارکان و طریق حسب ہدایت کتاب و سنت کیا کیا ہیں؟ لیکن مسائل حاضرہ کے استغراق اور وقت کی قلت کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مباحث کو اس خطبہ کے مطبوعہ نسخہ کے لیے اُٹھا رکھوں

اور یہاں صرف یہ عرض کر دوں کہ آئندہ کے لیے سب سے زیادہ مقدم اور بنیادی معاملہ کیا ہے۔

حضرات! اس موقع پر آپ کی توجہ اس خطبہ کے ابتدائی حصہ کی طرف مبذول کراؤں گا میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اس راہ میں شرط کامیابی یہ ہے کہ ہمارا عمل خالصاً لوجہ اللہ ہو اور نیز طریق ثواب پر ہو۔ اور طریق ثواب نہیں ہے مگر طریق سنت و منہاج نبوت اس لیے میں دو لفظ بولوں گا۔ ایک لفظ "تاسیس" ہے اور ایک "تجدید" ان کے معانی آپ پر روشن ہیں۔ "تاسیس" اساس سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ از سر نو کسی چیز کو بنانا۔ "تجدید" جدت سے ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پیشتر کی بنی ہوئی چیز کو تازہ کر دینا اور اس طرح سنوار دینا گویا وہ بالکل نئی ہو گئی۔ آج ہمارے قومی کاموں کی ہر شاخ میں ایک بنیادی غلطی یہی ہے کہ ہم نے اصولی طور پر طریق اصلاح کا فیصلہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے ضرورت طریق تاسیس کی ہے یا تجدید کی؟ یعنی اس کی ضرورت ہے کہ از سر نو نئی باتیں، نئے طریقے، نئے ڈھنگ، نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں۔ یا صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک مکمل کارخانہ ملت موجود ہے جس کو اپنے بقاء و ترقی کے لیے کسی نئی بات کی احتیاج نہیں۔ مگر طرح طرح کی خرابیاں عارض ہو گئی ہیں۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کر دی جائیں۔ کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں اور اس کو ایسا ہی بنا دیا جائے۔ جیسا کہ اصل میں وہ تھا۔

تاسیس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ نے ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ "تجدید" یہ ہوئی کہ مکان پہلے سے موجود ہے۔ صرف شکست و ریخت کی درستگی مطلوب تھی۔ پس آپ نے نقائص دور کر کے درست کر دیا۔ ہم کو غور کر لینا چاہیے کہ بنائے ملت کی درستگی کے لیے تعمیرات اساسیہ مطلوب ہے تو بلاشبہ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ نئے ڈھنگ اختیار کریں۔ لیکن اگر تجدید کی ضرورت ہے تو ہمیں نئی نئی چیزوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ پہلے سے جو چیزیں موجود ہیں ان کا کیا حال ہے اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ کیونکر دور کی جائیں۔

حضرات! دین کامل ہو چکا اور اتمام نعمت کا اعلان کر دیا گیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایک فرد واحد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ اصلاح ملت اسلامیہ کے لیے قرآن و شریعت کی تعلیمات و نظامات کافی نہیں ہیں۔ اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ پس یہ اصل تو متفق و مسلم ہے کہ راہ اصلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے، تاسیس کی نہیں ہے۔ خود شارع علیہ السلام نے بھی ہمیں تجدید ہی کی خبر دی نہ کہ تاسیس کی۔ "ان اللہ يبعث لهذه الامة على راس كل مائة سنة من يجدد لها دينها" (رواہ ابوداؤد عن ابی ہریرہ) لیکن میں عرض کروں گا کہ اگر یہ سچ ہے تو عملاً نتیجہ اس اعتقاد کا یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا قدم طلب اصلاح میں تاسیس کی طرف نہ جائے اور وقت کے نظر فریب اسلوب کار علی الخصوص یورپ کے مجلسی و اجتماعی طریقے ہمیں نظم شرعی سے روگرداں نہ کریں۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک تمام اعیان اصلاح کا طرز عمل اس کے مخالف رہا ہے اور یقین کیجئے کہ یہی علت ہے کہ اس وقت تک ہماری کوئی سعی اصلاح و ترقی فوز و فلاح نہ پا سکی۔ اسلام اگرچہ دین کامل ہے تو ضرور ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کی تمام انفرادی اجتماعی اور مدنی ضروریات کیلئے کامل و اتم تعلیم دے دی ہو۔ اگر وہ دین آخری ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تعلیم اور شارع کی عملی سنت ہر عہد ہر زمانے ہر حالت اور ہر مشکل کے لیے رہنما و کفیل ہو۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت ایسی ہی ہے اور اسلام نے ہمارے لیے تمام اجتماعی و قومی برکات کا سامان کر دیا ہے لیکن پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہم ان کھوئی ہوئی برکتوں کو واپس لینا نہیں چاہتے مگر نئی نئی راہوں کی جستجو میں حیران و سرگرداں ہیں۔ مثالاً میں چند امور عرض کروں گا۔

قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام و ظہور کیلئے ضروری ہے کہ ایک جماعتی سلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں اور تفرقہ و تشتت کی جگہ وحدت و اتحاد پیدا افراد قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریق عمل کی نقالی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیات اجتماعی کے لئے کوئی نظم ہمیں

دیا تھا یا نہیں۔ اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے خود اپنی کھوئی ہوئی چیز کیوں نہ واپس لے لیں۔ اور سب سے پہلے اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک مجالس نہ ہوں، اجتماعات نہ ہوں، انجمنیں نہ ہوں، کانفرنسیں نہ ہوں کوئی عمل انجام نہیں پا سکتا۔ نہ اتحاد و تعاون کی برکت حاصل ہو سکتی ہے۔ پس ہم آج کل کے مجلسی طریقوں کے مطابق انجمنیں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ اسی مقصد اجتماع و تعاون کے لیے اسلام نے پانچ وقت کی نماز باجماعت جمعہ و عیدین اور اجتماعِ حج کا حکم دیا ہے۔ یہ نظام و قوام درہم برہم ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے اُسے کیوں نہ درست کر لیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قومی فنڈ نہ ہو۔ اس وقت تک قومی اعمال انجام نہیں پا سکتے۔ پس ہم نئے نئے فنڈ قائم کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے مگر کاش کوئی یہ بھی سوچے کہ خود شریعت نے اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے اس کا نظم ٹھیک قائم ہے یا نہیں۔ اگر وہ قائم ہو جائے تو پھر بھی کسی چندہ اور فنڈ کی ضرورت ہوگی؟

ہم دیکھتے ہیں کہ قومی تعلیم عام کے لیے مجامع و محافل کی ضرورت ہے ہم اس کیلئے نئی نئی تدبیریں کرنے لگتے ہیں مگر کبھی یہ حقیقت ہمارے دلوں کو بے قرار نہیں کرتی کہ عین اسی مقصد سے شریعت نے خطبہ جمعہ کا حکم دیا۔ ہم نے کیوں اسکی برکتوں کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ قومی و اجتماعی کام انجام نہیں پا سکتا، جب تک اسمیں نظم و انضباط نہ ہو اور یہ نہیں ہو سکتا کہ جب تک اس کا کوئی رئیس و قائد مقرر نہ کیا جائے۔ پس ہم تیار ہو جاتے ہیں کہ جلسوں کے لیئے صدر تلاش کریں لیکن اگر یہی حقیقت شریعت کی ایک اصطلاح "امامت" کی ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمیں تعجب و حیرانی ہوتی ہے اور اس کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے!

حضرات! میں مثالوں میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے لیے کام عمل تجدید و احیا ہے نہ کہ تاسیس و اختراع۔ پس کسی طرح بھی یہ طریق صواب نہ ہوگا کہ علمائے

اُمت کی جمعیت بھی اپنے انتظام و قوام کے لیے محض آج کل کی مجلسوں کے قاعدوں اور طریقوں کی نقل و محاکات پر اکتفا کر لے۔ حاملین شریعت کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے عمل کے لیے ان مجلسوں کے ڈھنگ اور طریقوں کے محتاج ہوں۔ ان کی راہ اتباع شریعت اور اہتدا بہ مشکوٰۃ نبوت کی ہے۔ اور اسوۂ حسنۂ نبوت اور حکمت رسالت نے انہیں تمام انسانی طریقوں سے مستغنی و بے نیاز کر دیا ہے۔ ہمارا طریق عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے حکمت اجتماعیہ نبویہ کو اپنا دستور العمل بنا لیں۔ شریعت کے کھوئے ہوئے نظام کو از سر نو قائم و استوار کر دیں۔ اور اس طرح اسلام کی مٹی ہوئی سنتیں زندہ ہو جائیں محض مجلس آرائی اور ہنگامہ سازی ہمارے لئے کچھ سودمند نہیں ہو سکتی۔

حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کر دوں جس کو میں علی وجہ البصیرۃ آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اسکے کبھی عقدۂ کار حل نہیں ہو سکتا میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کر لیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں۔ اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ یہی اصل و اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات! اسلام کے نظام اجتماعی کی نسبت کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیق الٰہی سے اس وقت میرے گرد و پیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ

کسی حال میں بھی متفرق الگ الگ اور منتشت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع متحد اور کنفس واحدۃ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جا بجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جس قدر تفرقہ و تشتت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور و مرکز کے قرار پائی۔ اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کیا گیا۔ عقیدۂ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقتِ مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے۔ اور اسی بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا۔ "علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ" اور اسی لیئے نظم و قوام ملت کے لیے منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب و سنت اس بارے میں بے شمار ہیں۔ رسالہ خلافت میں اس پر بحث کر چکا ہوں میں یہاں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کرونگا۔ کیونکہ گذشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازہ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود تفرقہ و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظام جماعت بھی قائم رہا۔ لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانانِ ہند کا نظم جماعت بالکل درہم برہم ہو گیا اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آلِ عثمان کی موجود تھی اور مسلمانان ہند کے لیے بھی تمام مسلمانانِ عالم کی طرح وہی خلیفہ عہد و مطاع تھے، لیکن مسلمانانِ ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق علماً و عملاً پائگاہِ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجودہ عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنا فرض اسلامی انجام دیتے۔ اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہی ہے کہ دشوار تھا تو پھر ضروری تھا کہ اپنے لیے ایک نائب امیر یا امام منتخب کر لیتے اور اس کے ماتحت اعادہ حالی اور تہیہ کار اور ادائے فرض اسلامیہ میں کوشاں ہوتے لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا، اور جہاں غیر مسلم غلبہ و استیلا پر محکومانہ قناعت کر لی گئی وہاں اس اقلیم

فریضۂ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی بہرحال ایک زمانۂ دراز گذر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو انہیں کوئی رشتہ انسلاک ہے، نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ ہے، نہ کوئی قائد و امیر ہے اور نہ کوئی آمر محافظ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی و جاہلی ہے جسمیں یہ پوری اقلیم مبتلا ہو گئی ہے۔ اس حالت کے مفاسد و شرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضا گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے کیونکہ قضا کا وجود بلا قاضی کے ہو نہیں سکتا اور قاضی کا وجود امارت اور امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات! ایک منصب قضا ہے اور ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضا امارت کے مقاصد میں داخل اور اسکے ماتحت ہے مگر مقاصدِ امارت قضا سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس میں مقاصدِ امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں۔ صرف قضا کا ذکر نہیں کرتا۔ جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجرا کافی ہو۔

حضرات! اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد و اعمالِ ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیاء و تجدیدِ ملت اور قیامِ شرع و ادائے فرائض انجام دے سکتے ہیں جبکے لیے اولین شرط عقلاً و شرعاً وجودِ جماعتِ منتظمہ اور امارت صحیحۂ شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اسقدر بُعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کیلئے تیار ہیں مگر طریق شرعی اور اس کے نظام و قوام کے الفاظ سُن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں۔ صرف انہیں قواعد و اصول کو سامنے لائیے جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے لفظ امیر و امام میں مضمر رکھی ہے، یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جائے تو آپ اسکا

استقبال کریں اور امیر و امام کا لفظ آجائے تو نفرت و استکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی غلطی نہیں ہے جس کو راہِ تاسیس اور راہِ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اس کو بھی چھوڑیے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض اسلامی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے، جو آزادیِ ہند اور مسئلۂ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں، جو اس وقت تک سرشارِ غفلت تھے۔ اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانتِ خلیفہ، عہدِ حفظ و صیانتِ بلادِ اسلامیہ اور آزادیِ ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرضِ اسلام انجام دیں۔ خدارا بتلائیے، اس صورتِ حال میں بھی طریق کار کیا ہونا چاہیئے۔ اور ایسے وقتوں کیلئے آخر اسلام نے بھی کوئی نظامِ کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعوۂ تکمیلِ شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں۔ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجلس آرائی؟ کیا محض اتباعِ رجال اور تقلیدِ اربابِ ظن و تخمین۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہِ شرعی صرف وہی ایک ہے، اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔ جو فتنہ آج یورپ سے اُٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اسکے سیلاب بلادِ تاتار و چین سے اُٹھے تھے۔ اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالمِ اسلامی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلادِ شرقیۂ اسلامی کا یہی حال تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلا ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیامِ شرع کیلیے ولاۃِ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا۔ اسی بنا پر فقہائے متاخرین کے یہاں اسکی تصریح پاتے ہو کہ بلادِ مکرمۂ کفار میں طلبِ والیِ مسلم واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ نے انہی بلادِ محکومۂ تاتار کے لیئے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے ایک لمحہ کیلئے بھی بغیر کسی امام کے بسر نہیں کرنا چاہیئے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں، اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائضِ شرعیہ انجام دیں۔ فی الحقیقت احکامِ شرع کی رو سے

مسلمانانِ ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں یا نظامِ جماعت قائم کر کے ادائے فرضِ ملت میں کوشاں ہوں۔

حضرات! بعض اصحاب نے واضح و بین مسئلہ کی نسبت بھی شکوک و شبہات ظاہر کیے لیکن وہ سب کے سب اہلِ نظر و بصیرت کے نزدیک ما لایعبا بہٖ میں داخل ہیں۔ اور اس لیئے میں اُن کے رد و نقد میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔ بعض حضرات مسئلہ کی صحت و شرعیت تو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے لیے آمادۂ عمل نہیں کہ نفاذ میں مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں گی۔ میں عرض کروں گا کہ بلا شبہ دنیا کے ہر عملِ عظیم کی طرح اس عمل کی راہ میں بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ لیکن یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ کی راہِ عمل آسائیوں کا باغ اور راحتوں کا عیش کدہ ہے۔ آپ نے تو مشکلوں ہی کی طرف قدم اُٹھایا ہے اور دشواریوں ہی کی طلب کی ہے۔ آپ قوموں کی قسمت پلٹنے کے لیے اُٹھے ہیں اور تمام کرۂ ارضی کے ظلم و ضلالت سے آپ کو مقابلہ درپیش ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے؟ عمل و عزم سے ہی کنارہ کش ہو جائیے۔

تازہ پرورِ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

آپ نے خلافتِ اسلامیہ و جزیرۃ العرب کی حفاظت و دفاع کا اعلان کیا ہے آپ ہندوستان کی آزادی کے لیئے بے قرار ہیں۔ یہ کونسی آسائیوں کی راہ ہے؟ کونسی پھولوں کی سیج یہاں آپ کے لیے تیار کی گئی ہے؟ آپ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی قاہر و جابر طاقت کے دہن آز سے اس کا نگلا ہوا لقمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ یقیناً تنظیمِ جماعت کی راہ اس سے زیادہ دشوار نہیں ہے۔

حضرات! یاد رکھیے کہ آج آپ نے جس راہ میں قدم اُٹھایا ہے وہ سر تا سر مشکلوں اور آزمائشوں ہی کی راہ ہے۔ وہ پھولوں کی روش نہیں ہے۔ کانٹوں کا دشت بے کنار ہے اگر

آپ کے تلوے لذتِ زخم سے آشنا نہیں ہیں تو مشکلاتِ راہ کی شکایت نہ کیجیے۔ بہتر یہ ہے کہ دیبا و مخمل کے فرش پر لوٹیے اور راہ کی زخم و کاوش انہی لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو اس ذوق کے لذت شناس ہیں۔ اور حضرات! حق تو یہ ہے کہ جس راہ کو آپ مشکل کہہ رہے ہیں، ساری آسانیاں اسی میں پنہاں ہیں، اور جس کو آپ نے سہل سمجھ رکھا ہے مشکلوں اور دشواریوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ مشکلیں انسان کے بنائے ہوئے طریقوں میں ہو سکتی ہیں۔ مگر اللہ کی کھولی ہوئی فطری راہوں میں نہیں ہو سکتیں۔ نہ وہاں دشواری ہے اور نہ کسی طرح کا تنگی و حرج۔ البتہ ساری دشواری خود ہمارے نفس و غفلت ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور بلاشبہ جب تک اس سے ہمارا چھٹکارا نہ ہوگا کوئی عملِ حق بھی ہم پر آسان نہیں ہو سکتا۔

حضرات! بعض حضرات کا بیان ہے کہ اس سے ممکن ہے کوئی نیا فساد اٹھ کھڑا ہو۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہ طریقہ احکامِ شریعت سے ماخوذ ہے تو ہمارے سامنے یقین و برہان آگیا اب کیا آپ یقین کو شک کی خاطر چھوڑ دیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کوئی فساد پیدا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ فوز و فلاح حاصل ہوگی۔ پھر کیا شک لے کر آپ یقین کے مقابلے کے لیے اٹھے ہیں؟ وَ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

حضرات! سچ یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر اس حقیقت کے ہیں کہ مدتوں کی غفلت اور ترک و بُعدِ کتاب و سنت کی وجہ سے ہمتیں مفقود ہو گئی ہیں، عزائم معدوم ہو گئے ہیں اور عزائمِ امور کی راہ سے ہم سب یک قلم ناآشنا ہو گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سنتِ الٰہی وقت کی مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی عادتِ جاریہ کے مطابق سرگرمِ انبعاث و ظہور ہو اور توفیقِ الٰہی قیامِ حق اور مقامِ عزیمت دعوت کے لیے کسی مردِ غیب کے قلب کا انشراح فرما دے۔ یہ راہ اصحابِ عزم کی ہے اور فاتحینِ عہد کی۔ ضعفاءِ طریق اور درماندگانِ راہ کا یہاں گذارہ نہیں ہو سکتا۔ آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے جو وقت اور وقت کے سروسامان کو نہ دیکھے بلکہ

وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار و خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولانِ قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔ وہ وقت کا خالق و مالک اور زمانہ اس کی جنبشِ لب پر حرکت کرے۔ اگر انسان اس طرف سے گردنیں موڑ لیں تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لئے نیچے اتار لے۔ اس کا علم مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمتِ رسالت کے تمام اسرار و غوامض اور معالجۂ اقوام اور طبابتِ عہد و ایام کے تمام سرائر و قضایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفۂ کتاب و سنت اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلہ اور ساری اجسام و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

حضرات! ۱۹۱۴ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہو گا ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔ حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب و سعی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کر لیں گے اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفرِ حجاز کا ارادہ کر دیا اور میری کوئی منت و سماجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اسکے بعد میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن ایامِ نظر بندی میں بھی اس کی فکر و تبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ صوبہ بہار کے بعض احباب و مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اسی زمانے میں میرے عزیز و رفیق مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب رانچی میں مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سے سعی و تدبیر میں مشغول ہو گئے تھے۔ جنوری

۱۹۲۰ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریکِ خلافت کی تنظیم شروع ہوئی تو اس وقت بھی میں نے بار بار کوششیں کیں اور تمام کارکن طبقہ کو اس طرف توجہ دلائی۔ مگر حالات موافق و مساعد نہ ہوئے اور مجھے مجبوراً انہی اصلاحات پر قناعت کر لینی پڑی جو اس تحریک کے اندر رہ کر میں انجام دے سکتا تھا۔ گذشتہ موسم گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہو گئی کہ تمام ملک کیلئے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو تو پھر یہ ارادہ کیا اقلاً صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چونکہ صوبہ بہار میں تین چار سال سے ابتدائی بنیاد کام کر رہی تھی، اس لیے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ ہوئی۔ اور میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرت علمائے بہار کو مبارکباد دوں کہ انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام اعلیٰ حاصل کیا اور جمیعت العلماء بہار کے جلسہ میں تین سو مجمع علمائے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا۔ اس کے بعد ارادہ تھا کہ فوراً دوسرے صوبوں میں بھی کام شروع کر دیا جائے۔ لیکن یکایک بعض حضرات نے اس مسئلہ کی نسبت اخبارات میں قیل و قال شروع کر دی اور بلا ضرورت علمائے ملت کا انقسام عوام میں بصورت اختلاف وجدل نمایاں کر دیا گیا۔ یہ چیز مجھ کو اس کام سے ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں روک سکتی تھی۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظر عام پر آچکا ہے اور جمیعت العلماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کر سکتی ہے تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جمیعت کے حوالے کر کے بالفعل خود سبکدوش ہو جاؤں چنانچہ ارکانِ جمیعت کی ایک خاص مجلس شوریٰ منعقد دہلی میں یہ مسئلہ پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوا، اور اب اس کا آخری فیصلہ اس اجلاس کے ہاتھ میں ہے۔

اجلاس جمعیۃ العلماء ہند ——— لاہور

۱۸؍ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء

تقریر

ہندوستان میں بدبختی سے کوئی نظامِ شرعی جماعت اور قوم کے لیے نہیں ہے۔ ایسی حالت میں فی الحقیقت اگر منصبِ امامت کے فرض کو ادا کرنے کا کسی جماعت کو حق حاصل ہے تو وہ علماء کی جماعت ہے۔ اہلِ بصیرت کی جماعت ہے۔ اور اُن تمام لوگوں کی جماعت ہے جس کو اسلام اپنے یہاں اربابِ حل وعقد کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

حضرات! مجھ کو اس موقع پر جو معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھیں، خاص طور پر اصرار کیا گیا کہ میں اپنی عادت کے خلاف اُسے قلمبند کر دوں۔ یہ جس قدر بھی حقہ خطبہ کا تھا اگرچہ ایک حد تک بے صبری اور بد ذوقی سے سُنا گیا لیکن بہر حال میں آپ کا مشکور رہوں گا کہ آپنے یہ تمام حصہ سُن لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان منفرق داستانوں کے سننے کے بعد جو مختلف طرق رہ چکے ہیں۔ اس کا ایک سرسری خاکہ آگیا ہو گا۔

اب اس کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ دوسرے ٹکڑے کی جانب توجہ ہوتی۔ گو جو اگرچہ جمیعۃ العلماء کے عظیم مقصد میں داخل نہیں ہے۔ نفس جمیعۃ کے مقصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن فی الحقیقت وقت کا یہ عظیم الشان مسئلہ ہے جو نہ صرف جمیعۃ العلماء بلکہ عالم اسلامی کیلئے ہر قائل لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے لیے، بلکہ ہر انسانیت دوست اور انسانیت پسند انسان کے لیے جو مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا وقت کا مسئلہ تھا۔ اور ضرورت تھی کہ اس کی جانب بھی متوجہ ہوتا اور اس بارے میں بھی جمیعۃ العلماء کے مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ آپکے سامنے پیش کرتا۔ لیکن اب اس وقت جلسہ کا زیادہ بہتر زیادہ مستعد حصہ اس خطبہ میں صرف ہو چکا ہے اور جلسہ کی موجودہ حالت اسکے لیے متحمل نہیں ہے، کہ اب میں اس ٹکڑے کو زیادہ صراحت و تفصیل کے ساتھ عرض کر دوں۔ لیکن چند ضروری ٹکڑے

ہیں جن کو اختصار کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے گوش گذار کر دوں۔

اس وقت میری آپکے اس مجمع کے مقابلے میں حیثیت کیا ہے؟ میں اس وقت آپ کے سامنے ایک واعظ، ایک داعی، ایک مقرر نہیں ہوں۔ اس لیئے یہاں نہیں کھڑا ہوں کہ آپکے کانوں اور آنکھوں کیلیئے تماشہ بنوں۔ میرا کام ایک خاص فرض کا ادا کرنا ہے۔ لوگوں کے حسن ظن نے مجھے اس پر کھڑا کر دیا ہے۔ میرا فرض یہ ہے کہ جمعیۃ العلماء کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن خیالات کا اعلان ہونا چاہیئے وہ عرض کر دوں۔ اس وقت اگر آپ واعظانہ صحبتوں کا وقت لے کر آئے ہوئے ہیں تو اس کا بہترین وقت آپکے سامنے آنے والا ہے۔ اس وقت جو بیان آئے گا۔ وہ ادائے فرض ہے۔ سب سے پہلے جو مسئلہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ وہی مسئلہ ہے جو تمہاری زبانوں پر نہیں بلکہ تمہارے دلوں کے صفحوں پر نقش ہے یعنی مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کا تعلق، اسکی اہمیت، اسکے متعلق عمل میں مسلمانوں کے اوپر اس کا وجوب، مسلمانوں کے لیے انکی ضرورت نہ صرف ضرورت بلکہ ایمان و کفر کے امتحان گاہ کا ان کے لیے پیدا ہو جانا۔ ان تمام پہلوؤں کو نہایت تشریح کے ساتھ گذشتہ دو سال کے اندر میں بیان کر چکا ہوں۔ اور میں نہ چاہوں گا کہ وہ دہرائی ہوئی داستان پھر آپ کے سامنے دہراؤں۔

وقت کے حالات اس امر کا ضرور داعیہ رکھتے ہیں کہ اس امر کو ظاہر کر دوں کہ خلافت کے متعلق مسلمانان عالم اور علی الخصوص مسلمانان ہند کے مطالبات شرعی کیا تھے۔ تاکہ یک مرتبہ ان مطالبات کا اعادہ موجودہ حالت کے اعتبار سے اس امر کا فیصلہ کرے کہ ہمارے مطالبات کیا ہیں اور ان مطالبات کی صورت و نوعیت کیا ہے اور وہ دنیا کے ہر طرح کے خیالات سے ہر طرح کی مفاہمت سے، سمجھوتوں سے بالکل بالاتر ہے کسی طرح کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اس صحبت میں مجھ کو جو کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق جو ہمارے مطالبات تھے اسمیں نہ تو کچھ گھٹا سکتے ہیں نہ بڑھا

سکتے ہیں۔ نہ کوئی قدم پیچھے لے جا سکتے ہیں، نہ داہنے لے جا سکتے ہیں نہ بائیں۔ اس میں کسی طرح کا سمجھوتہ یا مفاہمت کا سوال نہیں ہو سکتا۔

اس بارے میں مسلمانوں کے مطالبات یہ تھے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے بالکل پاک کر دینا چاہیے۔ جزیرۃ العرب کے متعلق ہمارا یہ اعلان تھا کہ جزیرۃ العرب صرف حرمین کا نام نہیں ہے بلکہ عراق کا دو تہائی حصہ بھی حسب جغرافیہ اُس میں داخل ہے۔ اسلیئے عراق کی سر زمین، بصرہ کا علاقہ اور بغداد کا علاقہ جزیرۃ العرب میں داخل ہے جس وقت تک انگریزوں کا اثر جزیرۃ العرب کی ایک چپہ زمین پر باقی رہے گا، مسلمانانِ عالم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے صلح و سمجھوتہ کا ہاتھ برٹش گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں۔ جس وقت ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر، اتنے حصّہ پر کہ جتنے حصہ میں عراق کے اڑنے والے گرد و غبار کا ایک فرہ آسکتا ہے۔ اگر انگریزی حکومت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تسلط باقی رہے، یہ مسلمانوں کیلیئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں۔ وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔

جزیرۃ العرب کے بعد مسئلہ خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ وہ بھی آپ کو یاد ہیں۔ وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ وہ بھی آپ کو یاد دلاؤں۔

دوسری اہم چیز ہمارے سامنے فلسطین کی وہ سرزمین ہے جس کی تحریم ہمارے لیے ویسی ہی ضروری ہے۔ جب تک کہ اس کا ایک چپہ بھی غیر مسلم اثر میں باقی ہے۔ اس وقت تک محال ہے کہ ہمارے واسطے کسی صلح یا مفاہمت کا دروازہ کھل سکے۔ میں اس وقت ان دفعات کی تشریح نہ کروں گا جو خلیفۃ المسلمین پر بصورت شرائط عائد کیے گئے۔ یا خلافت کے اُن حقوق پر۔ جس وقت تک ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی باقی ہے اس وقت تک مسلمانانِ ہند کے لیے محال قطعی ہے کہ وہ صلح کا، اتفاق کا کوئی ہاتھ بھی

اس گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں۔ میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اب جب کہ حالات نے پلٹا کھایا، واقعات نے اپنا ورق الٹا اور حضرت غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی فوجوں نے یقیناً موجودہ جنگ کے میدان ہی کو نہیں بلکہ وسط ایشیا کے میدان کو ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے بار بار اسطرح کی چیزیں لائی جاتی ہیں اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کے مطالبات خلافت کیلئے سب سے زیادہ اہم چیز تھریس اور سمرنا ہے۔

لیکن میں اس وقت اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ سمرنا اور تھریس کا میدان فی الحقیقت وہ دونوں ایسے میدان تھے کہ اس کا فیصلہ ہو سکتا تھا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ فی الحقیقت تمام مسئلہ خلافت میں یہ ظلم نمایاں اور ابھرا ہوا تھا کہ بار بار مقررین خلافت اپنی تقریروں میں ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں علاقے یونان کو دلائے گئے ——— یونان فریق جنگ نہ تھا۔ جنگ سے اس کا تعلق نہ تھا۔ اس کو بار بار نمایاں کر کے پیش کیا جاتا تھا لیکن اس سے یہ مقصد نہ تھا کہ مطالبات خلافت میں اس کی اہمیت بمقابلہ دیگر معاملات کے ہے۔ میں اس امر کا اعلان کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ سمرنا اور تھریس کو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تلوار کی نوک کی قسمت پر چھوڑ دیجیے۔ ہمارا مطالبہ جزیرۃ العرب فلسطین اور شام کے لیے ہے بیت المقدس کیلئے ہے۔ اور ان شرائط کیلئے ہے جو پائیگا خلافت کیلئے عائد کی گئیں۔

مسئلہ خلافت کے متعلق جو عرض کرنا تھا، وہ چند اشارات تھے جو آپ کے گوش گذار کر دیے میرے فرائض میں سے ایک نہایت اہم فرض یہ بھی ہے کہ ایک دوسری جانب بھی کچھ نہ کچھ اشارہ کروں۔

میرا مقصد وہ حادثہ ہے کہ جس حادثہ کو آپ میں سے تقریباً تمام اخبار بین اور باخبر حضرات مختلف اخبارات میں پڑھ چکے ہونگے۔ میرا مقصد جنوب ہند سے مدراس و مالا بار کے اس حادثہ سے ہے جسکے متعلق طرح طرح کے نتائج و حالات آپ کے سامنے آچکے

ہیں۔ اِس موقع پر جمعیتہ العلماء کے اِس مجمع میں یقیناً اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس واقعہ کی نسبت احکام شرع کی رو سے جو ہمارا اعلان ہو سکتا ہے اس اعلان کو اختصار کے ساتھ میں بیان کردوں۔ تاکہ اس کے متعلق نہ کسی طرح اخفا رہے نہ غلط فہمی رہے اور نہ پیچیدگی باقی رہے۔ اس واسطے آپ مجھے اجازت دیں گے کہ موپلاؤں کے متعلق کچھ عرض کردوں۔

میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ جو واقعات ہوئے اس کے ملل کیا ہیں۔ اور جو داستانیں اس وقت تک ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں اُس کی صداقت کیا ہے۔ اب تک وہاں کے حالات تاریکی میں ہیں۔ اُس کی روشنی ہم تک نہیں آئی۔ ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ مدراس میل کا نامہ نگار ایک واقعہ لکھتا ہے اُس سے دوسری صورت ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے حقیقت میں اور صداقت میں اور ان واقعات میں ایسی صورت حائل ہے کہ وہاں کے اصلی حالات کو ہمارے سامنے نہیں آنے دیتی۔ آپ اس امر کا فیصلہ کرلیں کہ اس حادثہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ میں جو کچھ عرض کروں گا کہ وہ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ آپ میں سے کسی کو اس سے متفق ہوتے ہوئے تامل نہ ہوگا۔

دو چیزوں کے متعلق میرا فرض ہے کہ میں صاف صاف اعلان کردوں پہلی چیز وہ واقعہ ہے کہ جو وہاں رونما ہوا۔ یعنی وہ لڑائی، وہ جنگ، وہ فساد وہ تشدد کہ جو وہاں واقع ہوا ہے اور اس وقت تک اصلیت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہ خبر بھی بار بار بیان کی گئی ہے کہ موپلاؤں نے وہاں انگریزی حکومت سے لڑائی کی تلوار اٹھائی۔ اس کی علی التول اور اس کی حکومتوں سے لڑائی کی۔ اور یہ جو انہوں نے شمشیر زنی کی یہ واقعی انہوں نے خلافت کا نام لے کر کیا اور اس اعلان کے ساتھ کیا کہ خلافت کے مسئلہ سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے ہم نے تلوار اٹھائی ہے میں نہیں جانتا کہ وہاں کے اصل واقعات

کیا ہیں۔ اگر بالفرض یہ واقعہ صحیح ہو اور وہاں کے موپلاؤں نے یہ کیا ہو، تو ہمارے واسطے یہ بالکل صاف اور ہر طرح کے شبہ سے پاک ہے۔

فی الحقیقت اسلام کا نظام شرعی یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے تمام علماء مسلمانوں کے عام اہل الرائے، مسلمانوں کے عام اہل حل و عقد مجتمع ہو کر ایک فیصلہ کر دیں اور اس فیصلہ کا اعلان کر دیں تو بلا شبہ تمام مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس فیصلہ کو جمعیت کا فیصلہ سمجھیں، جمعیت کے ساتھ رہیں اور اس سے قدم نہ ہٹائیں۔ ہندوستان میں بدبختی سے کوئی نظام شرعی جماعت اور قوم کے لیے نہیں ہے۔ ایسی حالت میں فی الحقیقت اگر منصب امامت کے فرض کو ادا کرنے کا کسی جماعت کو حق حاصل ہے تو وہ علماء کی جماعت ہے۔ اہل بصیرت کی جماعت ہے۔ اور ان تمام لوگوں کی جماعت ہے جس کو اسلام اپنے یہاں ارباب حل و عقد کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ خواہ خلافت کی جماعت ہو یا جمعیۃ العلماء کی مقدس جماعت۔ اس جماعت نے کامل غور و فکر کے بعد تمام حالات دیکھنے کے بعد اس امر کا فیصلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ اس وقت ہم نے اپنے فرائض شرعی کے انجام دینے کے لیے مطالبات خلافت کے پورا کر دینے کے لیے جو راہ اختیار کی ہے، یہ راہ بلا قتل کیے اور بلا جنگ کیے ہے۔

میں نے وہ لفظ نہیں کہا جو تمہاری زبان پر جاری ہوتا ہے۔ یعنی تشدد یا عدم تشدد۔ اس امر کا انھوں نے فیصلہ کر دیا کہ مسلمانوں نے اپنے فرائض شرعی کی انجام دہی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ وہ ہے کہ جن کو سکون کے ساتھ بلا کسی قتل کے بلا کسی ایسی حرکت کے جو لڑائی کی ہو، سکون اور امن کے ساتھ اس راہ کو طے کرنا چاہیے۔ میں اس کے دلائل پر بحث نہ کروں گا۔ اگر وقت نے موقع دیا تو سن لوگے کہ اس کی تشریح کیا ہے۔ اب تمام تحقیقیں آپ کے سامنے منکشف ہو گئیں۔ پھر جب مسلمانوں کی بڑی سے بڑی ذمہ دار جماعت جو ہو سکتی تھی، احکام شرع کی رو سے وہ یہی جمعیۃ العلماء ہے۔ اس نے یہ راہ عمل قرار دی

کہ مطالبات خلافت پورا کرنے کیلئے مسلمانوں کو جو طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے وہ لڑائی کا نہیں قتال کا نہیں ہے، جنگ کا نہیں ہے، خونریزی کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو امن و سکون کے ساتھ طے کرنا چاہیئے

پھر جمعیت العلماء کا یہ فیصلہ تھا۔ اُس نے جو بڑی سے بڑی جماعت ملک میں ہو سکتی ہے جس وقت اس امر کا اعلان کر دیا۔ تو میں ان کو احکامِ شرع کی رو سے بتلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی کسی جماعت، کسی گوشۂ ملک کو خواہ وہ مالابار ہو یا ہندوستان کا کوئی گوشہ جہاں مسلمان بستے ہوں، بشرطیکہ ان کی جماعت کو اس فیصلہ کی اطلاع ہو چکی ہو۔ احکامِ شرعیہ کی رو سے اس اعلان کے بعد جائز نہیں ہے کہ اس جماعتی فیصلہ سے اپنے قدم کو باہر نکالے اور اس طرزِ عمل کو اختیار کرے کہ جس طرزِ عمل کو مسلمانوں نے بحیثیت جماعت رد کر دیا ہے۔ اس لیے میں اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر موپلاؤں نے خلافت کے مقصد کیلیے کر تلوار اٹھائی اور جنگ کی تو ان کا یہ عمل اُس جماعتی فیصلہ کے خلاف تھا جو ہندوستان کے علماء نے کیا ہے۔ اِس لیے یقیناً اُن کو ملامت کی جاسکتی ہے۔ کہ ان کو کسی حالت میں یہ حق نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے جماعتی فیصلہ سے قدم باہر نکالیں اور ہندوستان کے کسی گوشہ کو اس امر کا اختیار نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت نے جو فیصلہ کر دیا ہے اس سے روگردانی کریں۔ انفراداً اس کا اصول تم کو معلوم ہے، اس کا معیار تم کو معلوم ہے بحیثیت جماعت کے جو عمل انہوں نے اختیار کیا، بلا کسی تاویل کے یہ کھلی ہوئی چیز ہے کہ جب جمعیۃ العلماء نے فیصلہ کر لیا خواہ استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے۔ خواہ سر و سامان نہ ہونے کی وجہ سے۔ جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو راہ تم کو اس وقت اختیار کرنا ہے، وہ تلوار کی نہیں ہے بلکہ دوسری حقیقتیں ہیں جن کے ذریعہ سے اُس مقصد کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ جب مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا تو مسلمانوں کو یہ جائز نہ تھا کہ اس سے قدم باہر نکالیں۔ اگر انہوں نے قدم باہر نکالا تو انہوں نے ترکِ اجماع کیا۔ اس کے لیے ہم اُن کو ملامت کر سکتے ہیں، سرزنش کر سکتے ہیں ان کے اس ترکِ اجماع سے ہماری اس جماعت کو نقصان پہنچا ہے۔ تو احکامِ شرع کی رو سے ان کی تعزیر

کی جا سکتی ہے۔ بلا شبہ اس اعتبار سے یہ کھلی ہوئی چیز ہے۔ یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلافت کے مطالبات کی رو سے اور خلافت کے مقاصد کو اگر ترک کر دیجیے جب بھی ہندوستان کے مقتضیات کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کے لیے اٹھے اور اپنی لاشوں کو تڑپائے۔ موپلاؤں یا کسی مسلمان نے اگر اگر یہ سمجھ کر کہ ہم اس کو احکام شرع کی رو سے جہاد فی سبیل اللہ کر رہے ہیں تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہم اس کو گناہ نہیں کہہ سکتے۔ اس وقت نفسِ عمل سے کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن بحث یہ ہے کہ جن حالات میں وہ عمل کیا گیا اس کے اعتبار سے اس کے احکام کیا ہیں بلا شبہ شریعت نے جو روشنی ہمارے سامنے پھیلائی ہے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ علما کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ اس وقت جو راہ ہم نے اختیار کی ہے یہ تلواروں کی نہیں ہے۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تو مالابار کے مسلمانوں کو یہ حق نہ تھا کہ وہ جمعیت کے التزام کو ترک کر دیں اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو ان کو سرزنش کی جا سکتی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہاں واقعات کیا رونما ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق میں صحیح حالات نہیں بتا سکتا۔

بعض لوگوں کی طرف سے بیان کیا گیا کہ موپلا مسلمانوں نے جو کچھ کیا منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی بیان کی گئی کہ اس بستی والے ہندوؤں پر جبر کیا اور جبراً ان کو مسلمان بنانا چاہا۔ یہ صحیح واقعات ہمارے سامنے نہیں۔ یہ چیز جو ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے بیسیوں افسانے ہیں جو اس کے خلاف ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ خود میرے پاس متعدد خطوط مالابار سے آ چکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ یہ واقعات صحیح ہیں تو ہم کو چاہیے کہ جو ہمارے اعتقادات ہیں وہ مخفی نہ ہوں۔ ہمارا کھلا ہوا آشکارا مذہب ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم بیان کر دیں کہ ہمارا مقصد کیا ہے جیسا کہ ہمارے بہت سے علما نے شائع کیا ہے۔ ہر شخص متفق ہوگا کہ اگر وہاں کے مسلمانوں نے محض اپنے دل کا غبار نکالنے کیلئے ظلم جبر کر کے ان کو مسلمان بنانا چاہا ہے۔ تو ہم سے ہر شخص جس کو شریعت کا علم ہے اس کا اعلان

کرے گا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو ان کا یہ کرنا شریعت کا عمل نہیں ہے، بلکہ شریعت کی توہین ہے۔ شریعت نے کبھی حکم نہیں دیا ہے کہ جبراً مسلمان بنایا جائے۔ جن پر شریعت نے جبر کیا تھا اُن کے لیے بھی "جزیہ" کی راہ رکھی تھی۔ جن حالات میں یہ کیا گیا ہے، اس بے قاعدگی کو دیکھتے ہوئے کسی طرح کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ایک لمحہ کیلئے ان کا یہ فعل اسلامی فعل تھا۔ مسلمان اس اعلان کے لیے تیار ہیں کہ ان کے اس جبر سے، اس ظلم سے بشرطیکہ جبر ہوا ہو، ہندوستان کے کسی مسلمان کو دلی ہمدردی نہ ہوگی۔ ہماری ہمدردیاں انہی اسباب پر ہیں جو حق ہیں۔

اس کے بعد اگرچہ مطالبات بے شمار ہیں، لیکن ابھی میں نے ضمناً ایک چیز کہہ دی ہے۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مختصر بیان کو ختم کروں چاہتا ہوں کہ ایک غلط فہمی جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ الحمدللہ عمل میں نہیں، فعل میں نہیں لیکن لفظوں میں، اختصار کے ساتھ، اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں۔

تشدد و عدم تشدد یہ دو چیزیں ہیں کہ جو اس وقت ہمارے سامنے آئی ہیں اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہم نے عدم تشدد کی راہ اختیار کی ہے، نیز یہ بھی بار بار کہا جاتا ہے بطور ایک مسلم عقیدہ کے کہ اگرچہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تشدد کریں۔ لیکن وقت کی ضرورتوں کو دیکھ کر انہوں نے اس عقیدہ کو ملتوی کر دیا ہے۔ اس بارے میں چند الفاظ عرض کروں گا، اگرچہ وقت کوتاہ ہے اور جتنی تفصیل کی ضرورت ہے اتنی گنجائش نہیں ہے۔

سب سے پہلے میں یہ چیز لوں گا کہ فی الحقیقت تشدد اور عدم تشدد کی لفظی ترکیب جو اختیار کی گئی، یہ ترکیب ہی غلط ہے۔ اگر تشدد سے مقصود ہے "تشدد لغوی"۔ تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسلام نے کسی حالت میں ایک لمحہ کے لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کو کسی فرد کو تشدد کا حکم نہیں دیا ہے۔

تشدد کے معنی ہیں ظلم کے، اسراف و اتلافِ حق کے۔ پھر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اسلام نے ظلم کا حکم دیا ہے؟ اسراف کا حکم دیا ہے، بے جا زیادتی کا حکم دیا ہے۔ اسلام نے ان میں کسی ایک چیز کا حکم نہیں دیا۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تشدد سے مقصود یہی ہے کہ جو معنی اس کے ہیں۔ زیادتی کرنا، سختی کرنا، تو میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ ایک منٹ کے لیے بھی اسلام نے کسی حالت میں زیادتی و سختی کی اجازت نہیں دی۔ ایک اور چیز ہے، جس کی اسلام نے اجازت دی ہے، زیادتی نہیں ہے، ظلم نہیں ہے، مار پیٹ نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری چیز ہے، اس کا نام ہے جنگ، قتال، لڑائی۔ یہ ایک منظم عمل ہے جس کے شرائط ہیں، حالات ہیں، جو اس لیے نہیں ہیں کہ ظلم کو قائم کرے، زیادتی کرے، سختی کرے بلکہ اس لیے ہے کہ حقوق و عدل کو دنیا میں قائم کرے۔ بلاشبہ اسلام نے، شریعت نے جنگ کا حکم دیا ہے، جس طرح انسان کی فطرت اور نیچر جائز رکھتی ہے میں ایک منٹ کے لیے بھی تسلیم نہ کروں گا کہ اس نے تشدد کا حکم دیا ہے۔ جنگ دوسری چیز ہے، خونریزی، مار پیٹ اور قتل غارت دوسری چیز ہے۔ اسلام نے اس چیز کا حکم کبھی نہیں دیا ہے جس کو خونریزی سے تعبیر کرتے ہو۔ اس واسطے کہ وہ یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ دنیا میں خدا کی عالمگیر برادری کو قائم کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک لمحہ کے لیے خدا کی محبت قائم نہیں رہ سکتی جب تک محبت مٹانے والے دنیا میں باقی ہیں۔ دنیا میں خدا کا عدل قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ عدل کے مٹانے والے دنیا میں باقی ہیں۔ اس واسطے عدل کے قیام کے لیے محبت کے قیام کے لیے، انواعِ انسانی کی عالمگیر اخوت کے قیام کے لیے ضرورت ہے کہ جنگ کا وجود ہو، لڑائی کا وجود ہو، قتال کا وجود ہو، جو خدا کی زمین کو پامال کرنا چاہیں۔ جن کا وجود دنیا میں ظلم کے لیے ہے۔ بلاشبہ ان کے وجود کی گندگی سے زمین کو پاک کرنے کیلئے ضرورت ہے کہ تلوار بھی ہو اور وہ سرخی بھی ہو جو انسانوں کے خون سے تلوار پر جمتی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے، لیکن خاص شرائط

کے ماتحت۔ جس طرح کہ دنیا کی تمام قوموں نے، دنیا کے کل حصہ نے قولاً و فعلاً تقریباً دنیا کی تمام قوموں اور تمام طبیعتِ بشری نے اِس چیز کا اعتراف کیا ہے اِس بنا پر تشدد اور عدم تشدد کا جو استعمال کیا جارہا ہے، اور جن معنوں میں استعمال کیا جارہا ہے ان معنوں میں کسی طرح یہ استعمال صحیح نہیں۔ تشدد تو اسلام کے نقطۂ فکر سے کسی حالت میں جائز نہیں۔ اسلام کے نزدیک تو بجز عدل کے کوئی فعل انسان کا جائز نہیں ہو سکتا۔ تشدد کا حکم اسلام نے کسی حالت میں نہیں دیا ہے۔ جنگ کا حکم دیا ہے جب کہ جنگ عدل قائم رکھنے کے لیے ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ جج بھی قتل کرتا ہے اور ایک ڈاکو بھی۔ جج قتل کرتا ہے پھانسی کے تختہ پر۔ ڈاکو قتل کرتا ہے مظلوم انسانوں کے بستروں پر، لیکن دنیا جج کی تعریف کرتی ہے اور ڈاکو پر لعنت کرتی ہے۔ حالانکہ دونوں نے قتل انسان کا کیا ہے۔ لیکن ایک نے جو قتل کیا ہے زیادتی کے لیے اور دوسرے نے جو قتل کیا ہے وہ دفعِ تشدد کے لیے خدمتِ عدل کے قیام کے لیے، انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے جنگ کو جائز رکھا ہے۔ اس کے لیے تشدد کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب یہ دیکھو کہ مان لیا جائے کہ تشدد سے مقصود واقعی جنگ ہے، لڑائی ہے لیکن اب اِس بارہ میں ہمارا موجودہ طرزِ عمل کیا ہے۔ اِس بارے میں میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی عزیز جو یہ سمجھتا ہو کہ اس جمعیۃ العلماء کے اعضاء و اراکین نے اس امر کا اعلان محض کسی شخصی رائے کی بنا پر کیا ہے۔ کسی وقت کی مصلحت کی بنا پر کیا ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی آپ میں سے کسی کا خیال ہو تو آپ پر واضح ہو جائے کہ آپ کا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی درست ہو تو مسلمانوں کے لیے کسی ایسے عمل کے ترک کا مستحسن ہونا تو درکنار کوئی ملحدانہ عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان شریعت کی کسی تعلیم کو محض چند انسانوں کی خوشنودی کی خاطر ایک لمحہ کے لیے بھی چھوڑ دیں، ترک کر دیں۔ کوئی اِس طرح کا سمجھوتہ کر لیں، مفاہمت کر لیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمل اسلامی عمل نہیں ہے

یہ ایک سخت سے سخت ملحدانہ عمل ہے جس سے بڑھ کر ملحدانہ عمل مسلمانوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ کسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کی چھوٹی سے چھوٹی فرض کو ایک لمحہ کے لیے ترک کر دیں۔

اگر مسلمانوں نے تمہاری بولی میں ترک تشدد کی پالیسی اس لیے اختیار کی ہے کہ چند انسانوں کی مصلحتیں اور چند انسانوں کے آراء ان کے سامنے آگئی ہیں، تو اول تو یہ حقیقت کے خلاف ہے اور یہ اتنا بڑا سوء ظن ہے کہ اس سے بڑھ کر سوء ظن مسلمانوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ کہ اس بڑی جماعت نے وہ عمل کیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی شریعت سے منہ موڑ لینے کے۔ اس نے گردن نہیں موڑی ہے۔ اس نے جو اعلان کیا ہے اس کی بنا بھی احکام شریعت پر ہے۔ بلاشبہ موجودہ حالت میں احکام شرع کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو شرعی عمل ہو سکتا تھا وہ وہی تھا جو انہوں نے کیا۔ اور مسلمانوں کے علما کا اس پر مستقل ہو جانا کہ مسئلۂ خلافت کے لیے جن کاموں کو انجام دیں گے بلا لڑائی لڑے ہوئے کو انجام دینا چاہیے اس کی بنیاد بھی نظام شرعی پر ہے۔ محض ایک فرد یا ایک جماعت کی رائے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس آسمان کے نیچے کسی بڑے سے بڑے امام و خلیفہ کو، بڑے سے بڑے عالم کو ایک منٹ کے لیے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ کی شریعت کے خلاف کسی چھوٹے سے چھوٹی فرض کے خلاف خدا کے چند بندوں سے سمجھ نہ کر لیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس سے بڑھ کر کوئی ذلالت نہیں ہو سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ سوء ظن ایک لمحے کے لیے ممکن ہوتا تو ہم کو اپنی بدبختی پر شہادت دینی ہوتی۔

جمعیۃ العلماء نے اور ذمہ دار جماعتوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ راستہ لڑائی کا نہیں ہے جنگ کا نہیں ہے، حرب کا نہیں ہے، قتال کا نہیں ہے، خونریزی کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو جو راہ اختیار کرنا ہے وہ امن شرعی اور پرسکون ہے۔ ان کا یہ فیصلہ کسی شخصی رائے پر نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس کی بنیاد شریعت کے نظام پر ہے۔ اس روشنی پر ہے

جو شریعت کی رو سے ہمارے سامنے آتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہمارے لیے وہ صحیح راہ ہو سکتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے اور جس کو ہمیں آخر تک پہنچانا ہے۔

میرے دوست مولوی حسرت موہانی نے فرمایا کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ کیا دفاعی جنگ بھی ممنوع ہے۔ دفاعی جنگ ڈیفنس میں لڑنا۔ دفاع کا کیا سوال ہے میرا اعتقاد ہے کہ قرآن نے جن حالتوں میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا ہے، وہ دفاعی ہی نہیں ہے، بلکہ ہجوم کی جنگ بھی ہے۔ موپلاؤں اور مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے بعد اس کے کہ مسلمانوں کے اہل الرائے نے، صاحب بصیرت نے، ان سب نے جو متفق ہو کر متحد ہو کر اس امر کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ راہ عمل ہے تو ہندوستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے، کہ وہ اس سے علیحدہ قدم نہ لے جائے۔ مقصد اس وقت یہ ہے اور بلاشبہ یہ کھلی حقیقت ہے، اگر موپلاؤں نے ان ایام میں تلوار اٹھائی۔ تو ان کا یہ فعل ہماری اس جماعت کے فیصلہ کے، خلاف ہے اور اب اس کے اس فعل سے ہمارے تمام مقاصد پر جو اثرات پڑیں گے، ان کی بنا پر ہم ہمیشہ حکم لگائیں گے۔ اگر ان سے ہم کو مشکلات پیش آئیں جن کی مصلحت کی ہم کو ضرورت ہے تو ہم اس سے زیادہ سخت رائے ظاہر کریں گے اور احکام لگائیں گے کیونکہ ان کا یہ فعل ایسا فعل ہے کہ انہوں جمعیت کے فیصلہ کو ترک کر کے کیا۔ بشرطیکہ ان کو جمعیت کے فیصلہ کا علم ہو۔

کالی کٹ تک میں خود جا چکا ہوں۔ اور ان لوگوں سے مل چکا ہوں۔ یہ چیز کہ خلافت کمیٹی کا اعلان کیا ہے، ہندوستان کے علماء کا اعلان کیا ہے۔ یہ چیز پہلے ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ جس درجہ اعلان ہونا چاہیئے تھا ویسا اعلان نہیں ہوا، لیکن اگر ان کو علم تھا اور انہوں نے باوجود علم کے قدم اٹھایا تو ان کا قدم جمعیت کے عمل، جمعیت کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ اس سبیل کے خلاف ہے جو ہندوستان کے علماء کی جماعت نے اپنے لیے نکالا۔ یقیناً ہم اس کا بھی اعلان کر سکتے ہیں کہ آج کے بعد بھی

ہندوستان کے علماء کے خاص جماعتی فیصلہ کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی فرقہ کوئی جماعت جو کام کرے گی اگر وہ اس جماعتی فیصلہ کے خلاف ہے تو یقیناً اس کو ملامت کی جائے گی سرزنش کی جائے گی شریعت کے احکام ہم کو مجبور کریں گے کہ ہم انگلیاں اٹھائیں۔

موپلاؤں کی حرکات کے متعلق جو رائے میں دے سکتا ہوں یہ رائے تھی۔ اس وقت بحث یہ ہے کہ جو چیز ہمارے سامنے لائی گئی، جو صورت ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے کہا جاتا ہے کہ بلا حملہ کے انہوں نے مطالبات خلافت کا نام لے کر تلوار اٹھائی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعات کیا ہیں، ہمارے پاس بہت سے ایسے خطوط ہیں جن سے اس واقعہ کی تکذیب ہوتی ہے میرے پاس اس قسم کا مواد موجود ہے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے تھے وہاں بھی وہ واقعات کیے گئے جو آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیے گئے۔ ایک حد تک انہوں نے صبر کیا، جب پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ پیمانہ چھلکے، اگر ان پر حملہ کیا گیا، اگر ان پر کسی فوج اور کسی حکومت نے کسی جماعت نے کیا ہو، یا ہم پر اس وقت حملہ ہو تو اس کی کئی صورتیں ہیں ؛

ایک تو یہ کہ متعلق عام حالات حملہ آور کے۔ اس کے جواب میں قرآن بتلا چکا کہ یقیناً مسلمانوں کو حفاظت کرنا چاہیے۔ تلوار اٹھانا چاہیے اور مقابلہ کرنا چاہیے ؛

دوسری صورت یہ ہے کہ ہندوستان میں جو ایک خاص طرح کی بدبختانہ زندگی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان کے مسلمان برداشت کر رہے ہیں اور جس طرح انہوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے، نامردی کی وجہ سے۔ سرکشی کی وجہ سے تعلیم الٰہی سے اعراض کی وجہ سے جو طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ اس درجہ اس حالت میں غرق ہو گئے ہیں کہ اس حالت سے اُن کو نکالنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک پوری تعلیم کو الٹ دیا جائے اور ایک انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ہندوستان کے اندر بھی خاص طور پر مظالم کیے گئے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ بسنے والی حلیف قوموں کا خون بہایا گیا۔ اسلامی حکومت کے مقابلہ میں اس حکومت کی فوجیں صف

آمادہ ہو گئیں۔ ایسی حالت میں اب ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ تک پہنچی ہے اور جو دو سو برس سے اس زندگی کو گوارا کیے ہوتے ہیں، اب ہندوستان کے مسلمان کیونکر اپنے فرائض شرعی کو انجام دیں۔ تو اگر ہندوستان کے علما نے، اہل الرائے نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ بلاشبہ ایسی منزل عمل آگئی ہے، ایسے نتائج موجود ہیں، اس طرح بے استطاعتی کا طرح کی غفلت و بے سروسامانگی آج تمہارے گھر میں نہیں، بلکہ تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے تلوار ایک لوہار کے یہاں نہیں تو دوسری جگہ مل جائے گی۔ ہندوستان کے علماء نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ حکم ہے کہ تمام مصائب کو جھیل جائیں، حملہ ہو تو اس کو بھی جھیل جائیں، قیدخانہ کے دروازے کھولے جائیں تو اس کو بھی جھیل جائیں۔ اگر انہوں نے یہ فیصلہ کیا تو ان کا یہ فیصلہ احکام شرع کے خلاف نہیں ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ موجودہ حالت میں جب ہندوستان کے مسلمانوں نے بحیثیت جماعت کے یہ فیصلہ کر لیا تو ہندوستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی پیروی کرے، اس سے منحرف نہ ہو۔

موپلا اور مالابار کے مسلمانوں نے اگر یہ سوچا ہے تو اس کے کہہ دینے میں ہم کوئی باک نہیں رکھتے کہ انہوں نے ایسا کیا کہ مسلمانان ہند کے متفقہ طرز عمل سے انہوں نے انحراف کیا۔ یقیناً ان کو ملامت کی جا سکتی ہے اور ان کو سرزنش کی جا سکتی ہے اس عمل کے وہ ذمہ دار ہیں ہم شریک نہیں ہیں۔

اس امر کے متعلق جو مجھ کو عرض کرنا تھا کر چکا۔ تشدد کے متعلق جس چیز کو ظاہر کرنا چاہتا تھا یہ تھا کہ ہم نے یہ طرز عمل اختیار کیا ہے تو محض اس لیے کہ چونکہ علمائے دین کا فیصلہ ہے۔ اس طرح کسی انسان کا پیش رو ہونا کسی قائل لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ پس ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ معلوم کریں کہ تمہاری زبان کے مطابق مسلمان عدم تشدد پر عامل رہیں گے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ امید ہے کہ

آنے والے دو دلوں کے اندر وہ بھی آپ کے سامنے آجائے

حضرات! اب اس کے بعد جو ضروری ٹکڑے ہیں جن کو میں اس وقت نظر انداز کرتا ہوں۔ وہ ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ اس اتحاد کے متعلق احکام شرعی کیا ہے؟ اس امر کا قطعی فیصلہ کہ اس بارے میں احکام شریعت کیا ہیں، حالاتِ گذشتہ کی بنا پر اور آئندہ آنے والے حالات کی بنار پر ایک نہایت ضروری موضوع یہ تھا لیکن میں اس کو اس وقت نظر انداز کرتا ہوں۔ شائد کل یا پرسوں عرض کروں گا۔ اس لیے کہ وقت کی صورت مساعدت نہیں کرتی۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے، جو ایک ہندی لفظ کے بھیس میں سوراج کے لفظ میں آیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ محض لباس کا تغیر آپ کو حقیقت و معانی سے ناآشنا نہ کر دیگا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حقیقت آپ کے لیے کوئی نئی حقیقت نہیں ہے انیا پیغام نہیں ہے عمل کا کوئی نیا دروازہ نہیں کھلنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کرۂ ارضی کے نیچے دنیا کی کوئی جماعت، قوم، فرد نہیں ہے کہ جس کو اس کے خدا اور رسول نے اس حقیقتِ محبوبہ کو اس کے دل کے ایک ایک گوشہ میں نہ رچا دیا ہو، اور اس کے تمام جسم میں نہ پھیلا دیا ہو یہ حقیقت ہے جو تیرہ سو برس سے آپ کے سامنے موجود ہے۔

(اس موقعہ پر یکایک بجلی کی روشنی گل ہو گئی اور تمام ہال میں تاریکی چھا گئی۔ رضاکاران نے گیس لیمپ اور لالٹینیں ہال میں منگائیں لیکن چند منٹوں کے بعد ہی بجلی کی روشنی پھر ہو گئی جس پر حاضرین نے نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا۔)

عزیزانِ من! آج کی صحبت صرف دس منٹوں کی اور باقی رہ گئی ہے۔ عزیزانِ من یہ روشنی ایسی قیمتی نہ تھی جس کے ملنے پر نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ ہاں اگر ایمان کی روشنی مل گئی تو اس کے لیے جس قدر چاہو نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ اگر آپ خاموشی سے کام لیں تو آج کی صحبت چند منٹوں میں ختم ہو جائے گی۔ بہرحال یہ ضروری مسئلہ تھا اب اس کا اجمالی ذکر بھی آج کی

صحبت میں ملتوی رکھتا ہوں۔ ان شاء اللہ بشرطِ زندگی اور توفیق الٰہی کل وپرسوں کی صحبتوں میں بیان میں آجائے گا۔

اگر حقیقتاً آپ کے قلب کے اندر وہ شوق معانی و ذوقِ عرفانی پیدا ہو گیا کہ آپ حق کی صدائیں سننے کے لیے اپنے سینوں کے اندر ایسی لازوال آشفتگی رکھتے ہیں کہ بستر کی آرام دہ کروٹیں قربان کر دیں۔ رات بھر کی تکلیف اور اختر شماری، تب بھی آپ اس صدا کے سننے کے لیے تیار ہیں تو میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اس کے خرچ کرنے کے لیے یہ موقع نہیں ہے کہ بہت زیادہ دیر تک میری تقریر سنیں بلکہ اس کے خروج کرنے کا اصلی محل یہ ہے کہ اللہ کے عشق میں، اس کے اتباع میں اُس کی پیروی میں، اس کی راہ میں سب چیز قربان کرنے کے لیے اپنے شوق دکھلاؤ، اپنے دل کے جذبات کو دکھلاؤ: تاہم میں آپ کے ذوق و شوق کا معترف ہوں۔:۔

تحریری خطبہ صدارت کے سننے کے وقت لوگوں میں ایک مرتبہ شور ہوا۔ اس پر حضرت مولانا نے پبلک کو سختی سے تنبیہ کیا تھا۔ اس کے متعلق یہاں بیان معذرت ہے۔

اور ساتھ ہی اس امر کی بھی آپ سے معافی چاہوں گا کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی خطبہ صدارت کے اوراق بنائے جا رہے تھے۔ تو موضوع روکھا پھیکا تھا۔ اور کچھ طرزِ بیان روکھا پھیکا۔ اگرچہ میرے عزیز سرسری طور پر اُسے دیکھ چکے تھے۔ پڑھنے میں بھی رکاوٹ ہوئی۔ اور پبلک میں شور رہا۔ مجھے مجبور ہو کر اس لب و لہجہ میں کہنا پڑا اور علی الخصوص جب کہ ایسے بزرگوں کا مجمع موجود ہے میں اس لب ولہجہ کا عادی نہیں ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایک حقیقی صورت کے احساس نے مجھ کو مجبور کیا کہ اس لب ولہجہ کو اختیار کروں:۔

ہماری مجلسوں سب سے بڑا جو جائز مطالبہ ہے۔ قولاً و شرعاً ایک نظام ہے۔ انضباط ہے، صبر ہے۔ اگر ہم میں اس وقت اتنا صبر پیدا نہیں ہوا ہے کہ ہمارے چند

ہزارہ نفوس موجود ہیں اگر وہ چیز ان کے سامنے آتی ہے اور ان کو بتلایا گیا ہے کہ وہ سکون کے ساتھ سنیں تو یقیناً ہمارے اندر اتنا صبر اور قاعدہ ہونا چاہیے اور ان لوگوں کی اطاعت کا جذبہ ہونا چاہیے جن کو ہم مستحق اطاعت سمجھتے ہیں۔ مان لو کہ یہ چیز تمہارے لیے کڑوی کسیلی تھی۔ لیکن اگر آدھ گھنٹہ کے لیے تم اتنی تلخی گوارا نہیں کر سکتے تو اللہ کے راستہ میں قربانی کی تلخی کیسے گوارا کرو گے۔ وہ ہنگامہ جو بار بار گزرتا تھا میری طبیعت کو ناگوار گزرا اور اس لب ولہجہ میں آپ کو مخاطب کیا جس کا میں عادی نہیں ہوں۔ اگر کسی عزیز کو ناگوار گزرا ہو تو معافی چاہتا ہوں، وقت بھی زیادہ ہو چکا ہے اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے۔

میں علمائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا حسنِ ظن میرے لیے توشۂ آخرت ہوگا۔

صوبائی مجلسِ خلافت ——— بنگال

۲۸ر فروری سنہ ۱۹۲۰ء

میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر پکار رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں ——— تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں ——— افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک ہیں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

برادران و بزرگان ملک و ملت!

آپ کے صوبے کی یہ پہلی خلافت کانفرنس ہے جس کی صدارت کی عزت مجھے دی گئی ہے آپکی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس بات سے واقف ہوگا کہ اس قسم کی رئیسانہ اور رسمی حیثیت کا اختیار کرنا میری زندگی میں سب سے پہلا واقعہ ہے اور اس طریق عمل سے مجھے روگرداں و منحرف ثابت کرتا ہے جس پر نہایت اصرار کیساتھ قائم رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں ۱۹۱۲ء میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا مجھے موقعہ ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کیلئے ایک "مذہب عمل" قرار دے لوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔ اسوقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصول و مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا انمیں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت۔ انجمنوں کے عہدہ عمل اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے ایک قلم کنارہ کش رہوں گا۔

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہ عمل اختیار کی تھی۔ وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی۔ موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔

سامنے تمام جد و اقتدار کیلئے نوعِ انسانی کے اُن مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ اور جنکے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں "حکمت" اور "سنت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام کے رہنما ہاتھوں میں دینے کیلئے مضطر تھا۔ گریبالڈی۔ میزینی۔ یا گلیڈ اسٹن اور پارنل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشۂ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا۔ یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار۔ لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوت و مذاہب کا ایک ہی اِدارہ، انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریسیڈنٹ ہو۔ خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت، ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے۔

حضرات! اس مذہب عمل کے اس بنیادی اعتقاد نے میرے لئے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دیں۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے ہی سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا۔ یہ مدینہ زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلووں سے معمور ہے۔ میرے لئے ہمیشہ سنسان رہی یا ایک صحرائے دیگر رہا۔ لیکن کبھی بھی آبادی اور بستی کی ہوا سے کام نہیں دیا۔ اور نہ کبھی میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اسکی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں۔ تاہم آپ حضرات کیلئے یہ عرض کرنا ضروری نہیں ہے کہ جہاں تک ایک ناچیز انسانی ہستی ارادہ و یقینِ عمل کو جمع کر سکتی ہے میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کیلئے ہمیشہ سخت رہا ہوں اور موجودہ زمانے کی لیڈر شپ کی دلفریب و دلفریب نمائشیں اور ابناء عصر کی رفاقت و معیت کی صبر آزما دلچسپیاں بھی کبھی اس بارے میں میرے لئے مؤثر نہیں ہوئی ہیں۔

اسی بنا پر جب آپکے لائق اور سرگرم سیکرٹری کا تار مجھے بنارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت آپکو منظور کر لینی چاہئے تو میں نے اداء تشکر و امتنان کے بعد اپنے آپکو اس سے معذور ظاہر کیا۔

لیکن جب میں کلکتہ پہنچا اور اس بارے میں زبانی گفتگو ہوئی تو کچھ عرصہ کی رد و کد کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یقیناً اپنے دستور العمل سے ایک کھلا انحراف ہے لیکن آپ یقین کیجئے کہ اس انحراف کیلئے جس چیز نے مجبور کیا۔ اسکی حفاظت بھی میرے لئے تمام اصولوں و قواعد عمل

سے زیادہ ضروری تھی۔ اصول مقاصد کیلئے ہیں۔ مقاصد اصول کیلئے نہیں ہیں۔ پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر بڑی چیز کیلئے چھوٹی چیز کو اور ہمیشہ مقاصد کیلئے وسائل کو قربان کر دینا چاہیئے۔ میں طیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے ایک وسیلے یعنی اپنے طریق عمل کو خیر باد کہہ دوں۔ اور اس مجلس کی صدارت منظور کرنے سے انکار نہ کروں۔

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ وہ اصلی سبب بھی عرض کر دوں جس نے مجھے یکایک اپنے طریق عمل کے برخلاف اس بات کیلئے آمادہ کر دیا۔ آپکو معلوم ہے کہ مجھے نظربندی کے گوشۂ قید سے نکلے ہوئے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہونگے۔ لیکن اس تھوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کر لیا ہے کہ موجودہ اسلامی و ملکی مسائل کی نسبت کام کرنیوالوں کے طریق عمل کا کیا حال ہے؟ مجھے صاف صاف عرض کر دینا چاہیے کہ ملک کے کار فرما طبقہ کی نسبت اب سے سات سال پہلے جو رائیں میں نے قائم کی تھیں اور جن کی وجہ سے بسا اوقات نہایت قیمتی اور محبوب رفاقتوں سے بھی دستبردار ہو جانا پڑتا تھا۔ بدقسمتی سے ابتک ان میں تبدیلی کا وقت نہیں آیا ہے۔

متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جسکو اپنے چاروں طرف پاتا ہوں۔ ایک طرف ملک کی عام پبلک ہے اور سورج کی روشنی کی طرح بالکل یقینی صورت میں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ کسی صحیح راہ عمل پر چل کھڑے ہونے کیلئے منتظر و مستعد ہے۔ دوسری طرف کام کرنیوالوں کی جماعت ہے اور جس پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر اب تک وہی تذبذب و اضطراب، وہی تزلزل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ ابتک مقاصد سے غافل ہے اور وسائل میں انہماک ابتک حقیقی مصلحت بینی اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے۔ عمل و عزم یقین کی جگہ ظن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے۔ زبانوں کی لکنت دور ہو چکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا لیکن دلوں کی دہشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے ابتک رد جوں کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ زبانیں جس قدر تیز ہیں۔ قدم میں اتنی تیزی نہیں ہے اور اعلان جس قدر بلند آہنگی کے ساتھ نکلتا ہے عمل میں اس قدر بلند پیمائی نظر نہیں آتی۔ نیند گو ٹوٹ چکی اور شاید خفتگان بستر غفلت کروٹیں بدل چکے لیکن آنکھوں میں خمار بدستور باقی ہے اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک

کہیں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہیں رہی لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا ڈر اور ایمان کے ساتھ نفس کا عشق بھی باقی ہے۔ ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا۔ اور چاہتے ہیں کہ دونوں راہوں کے بین بین کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔ حالانکہ تیسری راہ آسمان کے نیچے کوئی نہیں۔ راہیں صرف دو ہی ہیں فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر حضرت مسیح نے کہا کہ ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے۔ ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ یعنی: سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

حضرات! مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے اگر میں حقیقت کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ افسوس کہ وقت کی جلدی اور قانون قدرت کی بے صبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی بے پروائی کیساتھ نتائج و عواقب کی آخری منزل تک بڑھتا چلا آیا ہے۔ اب موت و حیات، بقا و فنا۔ ایمان و کفر اور خدا و ماسوی اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے اور اسلئے میں قابل ملامت نہیں ہوں اگر حسن بیان اور بلاغت اظہار کے پر پیچ آداب و قواعد کو موت و حیات کی کشمکش میں سنبھال نہیں سکتا۔ یہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر مجھکو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقع ملے تو میں اس سے انکار نہ کروں۔ اور اگر صدارت کے حقوق و اختیارات کو اصل مقصد کیلئے استعمال کر سکتا ہوں تو اسکو ایک مفید فرصت تصور کروں۔ شاید اسطرح اس صحیح راہ عمل کیطرف کوئی قدم اٹھ سکے جسکو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں۔ لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا ہے اور آج بھی جبکہ اس اعراض کے نتائج سامنے ہیں تذبذب و اضطراب عملی عزم و ایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے۔

حضرات! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آپ نے اپنی محبت سے مہربانی سے جو عزت مجھے دینی چاہی ہے اس سے گریز نہ کروں۔ میں آپکا شکر گزار ہوں اور آپکی عملی رفاقت و اعانت کا طلبگار۔ ہم سب کو اللہ کے فضل و توفیق پر اعتماد ہے جسکے بغیر کائنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پا سکتا۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے   پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

خلافت عربی زبان کی ایک مصدر ہے۔ اس کا مادہ ہے "خلف" اور اسی سے ہے۔ "خلیفہ" خلیفہ کے لغوی معنے نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔ من قولک خلف فلان فلاناً فی ھذا الامر اذا قام مقامہ فیہ بعدہٗ (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد اس کا نائب و قائم مقام ہوا، تو یہ خلافت ہوئی اور لغت میں اس کو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہیں گے۔ خواہ یہ نیابت موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو یا غیبت کی وجہ سے یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے۔ مفردات امام راغب میں ہے "الخلافۃ النیابۃ عن الغیر اما بالغیبۃ المنوب عنہ، واما لموتہ واما لعجزہ و اما لتشریف المستخلف (۵۵)

یہ لفظ بھی قرآنِ حکیم کے اختیاراتِ لغویہ میں سے یعنی عربی زبان کے اُن لفظوں میں سے ہے۔ جن کو لغت میں عام معانی کے لیئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر قرآنِ حکیم نے اپنے خاص مطلوبہ شرح معنی کے لیے اختیار کر لیا۔ جیسے ایمان، غیب۔ تقدیر، بعث، صلوٰۃ وغیرہ ذٰلک۔ ایمان کے لغوی معنی یقین اور طمانیت اور زوالِ خوف و شک کے تھے۔ لیکن قرآنِ حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کے لیے استعمال کیا اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافت

اور استخلاف فی الارض اور وراثت و تمکن فی الارض سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافتِ ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے۔ ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے۔ ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانیت دنیا میں پھیل جائے اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عمل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے ذرات تک نافذ و قائم ہے اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و مسرت کی ایک بہشت زار بنا دے۔

لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس لیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں، اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی اور ہر خلیفہ سابق کا قائم مقام۔ ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفۃ اللہ داعیٔ حق و شارع اسلام تھا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلعم اور پھر اُن کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی وہ اس خلیفۃ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے۔ اس لیے ان پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گذار رہے۔ آیاتِ ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ۔	وہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین میں خلافت دی۔

وَيَسْتَخْلِفْ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔

اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو میرا پروردگار تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو دے دیگا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ؟

پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں،

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ۔

اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ۔

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔

اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں ہی کی وراثت میں آئے گی۔

یہی چیز زمین کی تمکین یعنی طاقت و عظمت کا جماؤ اور قیام بھی ہے جو سرزمین فراعنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی جب وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق و صالح کی قوت سے، ایک دن مصر کے تاج و تخت کا مالک ہو گیا۔

كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ

اسی طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر میں قائم کر دی۔

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین میں جما دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم

وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے نیکی کا حکم دینگے اور برائی سے دنیا کو روکیں گے۔

اس آیۂ کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ تمکین فی الارض یعنی حکومت کا مقصد اصلی قرآن حکیم کے نزدیک کیا ہے؟ معلوم ہو گیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے۔ نیکی اور راستی کا اعلان وظہور ہو۔ برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے۔

دوسری آیہ میں اس کو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا ٹھیک اسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے اور ایسا کریگا کہ ان کے لئے ان کا دین حق قائم ہو جائیگا اور خوف کی گھڑیاں امن کی خوش حالی و کامرانی سے بدل دی جائیں گی۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔ جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سروسامانی حال سا تھ دشمنوں کے پے در پے حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتھیار اپنے جسم سے دور نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔ مَا يَاتى علينا يوم نامن فيه ونضع عنا السلاح؟ (ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں آیا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح و شام

بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کر سکتے) ابوالعالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا۔ مظلومی و بے چارگی کی جگہ فرمانروائی و کامرانی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آجائے گی۔

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز "خلافت" ہے۔ وہ خلافت فی الارض ہے یعنی زمین کی حکومت و تسلط۔ پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا۔ جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اُسے حاصل نہ ہو۔ وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک اسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔ اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خدا و رسول کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا۔ ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے اور اس کا مٹانا اس کے ظہور کا پہلا کام تھا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ آٹھ نو سال بعد جب داعیِ اسلام دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلے کے لیے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں۔ اس سلسلہ خلافتِ اسلامیہ کا پہلا خلیفۃ اللہ خود حضرت داعیِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مقدس تھا اور اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ آپکے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ (ابن ماجہ من العرباض بن ساریہ) آپکے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفہ

رسول اللہ تھے۔

آنحضرت کے بعد خلافت اپنے خصائص و نتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہو گئی۔ خود آں حضرت نے نہ صرف اُن کی پیشتر سے خبر ہی دی تھی۔ بلکہ تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان کر دیے تھے۔ اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں۔ وہ کثرت طرق شہرت متن، قبول طبقات کی بنا پر حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلا سلسلہ خلافت خلفائے راشدین مہدیین کا تھا۔ جن کی خلافت منہاج نبوت پر تھی یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعیت شخص رسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق ٹھیک ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا اور اس لیے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جز تھا اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا۔ اسی طرح اُن کی شخصیت بھی جامع و حاوی تھی دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظام شریع، نظام حکومت اور نظام سیاست، یہ تمام ترقیں اُن کی ذات واحد میں جمع تھیں۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومت شوریٰ جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ری پبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔

دوسرا سلسلہ منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و بادشاہت کا۔ جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلہ میں پہلے سلسلہ سے اقرب تھا لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص بعید ہو گئے تھے۔ خلفائے بنو امیہ سے لیکر آج تک جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے۔ وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلبہ طریق ہدایت و نبوت خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست و شخصیت بادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ "الخلافۃ بعدی ثلثون عاما ثم ملک بعد ذالک (اخرجہ اصحاب السنن) اور حدیث ابو ہریرہ "الخلافۃ بالمدینۃ والملک بالشام" ایک دوسری حدیث میں

بالترتیب تین دور تبلائے گئے ہیں "نبوۃ و رحمۃ ثم خلافۃ و رحمۃ" وفی لفظ "خلافۃ علی منہاج النبوۃ ثم یکون ملک عضوض (رواہ البزار وقال السیوطی حسن) امیر معاویہ نے اسی کی نسبت کہا تھا۔ ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کرلی۔

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے۔ عہد نبوت و رحمت ، خلافت ، و رحمت بادشاہی فرمانروائی۔ پہلا دور آنحضرت کی وفات پر ختم ہوگیا۔ دوسرا دور فی الحقیقت عہد نبوت کا ایک تتمہ اور لازمی جزو تھا جیسا کہ سلسلۂ دعوت اور تکمیل کاروبار شرائع میں ہمیشہ سنت اللہ رہی ہے۔ یہ حضرت امیر علیہ السلام پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد محض عہد پادشاہی و استبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دور کی بہت سی مختلف شاخیں علیحدہ علیحدہ احادیث میں بتلائی گئی تھیں اور وہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں۔ نبوت و رحمت کی .... برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا اور بدعات و فتن کے ظہور و اشاعت کی ایک تدریجی ترقی تھی کالحصیر عوداً عوداً جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی بلکہ تمام و نظام امت کے مبادیات و اساسات سے لے کر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک ، ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔ فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھی۔ جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابۃ بالفتن) حضرت عمر کا وجود تھا۔ جونہی یہ بنیاد مرموس ہوئی۔ وہ سیلاب عظیم امنڈ آیا اور پھر کوئی سد و بند اس کی راہ نہ روک سکا۔ اسی سیلاب کو حضرت حذیفہ کی روایت میں "التی تموج کموج البحر" (رواہ البخاری) سے تعبیر کیا گیا تھا یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اس کی موجیں اٹھیں گی۔ سو واقعی یہی ہوا اور دور خلافت و رحمت اور "خلافۃ علی منہاج النبوۃ" کی عظیم الشان عمارت اس کے تلاطم اور طغیان میں آناً فاناً بہہ گئی۔

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول کے خصائص تازہ کر دے گا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ "لایدری اولہا خیر ام آخرہا" نہیں کہا جا سکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اس کا اختتام یہی وہ آخری زمانہ ہوگا۔ جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں پورا ہو کر رہے گا کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ دین اسلام اور اس کا رسول اسلئے آیا تھا تاکہ تمام دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہو کر رہے (کیونکہ آخری غلبہ تھا صرف اصلح کے لیے ہے اور تمام دینوں میں اصلاح صرف اسلام ہی ہے) یہی وجہ ہے کہ یاس بیسوں اور ناامیدیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک مومن قلب کے لیے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں۔ بلکہ جسقدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ طلوع صبح کا وقت قریب آتا جاتا ہے ان موعدہم الصبح الیس الصبح بقریب!

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

آپ آزردہ خاطر نہ ہوں، مگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کے لیے اپنی اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کر لے۔ اس مقام کی مزید وضاحت کے لیے بہتر ہوگا کہ دو خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں۔

ایک "اجتماع" اور "ائتلاف" ہے۔ دوسرا "تشارات" اور "انتفار"۔ نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کئے ہیں ان سب سے زیادہ اہم حقیقت انہیں الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ "اجتماع" کے معنی ہیں "ضم الشیٔ بتقریب بعضہ من بعض (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا۔ ائتلاف "الف" سے ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ ما جمع من اجزاء مختلفۃ ورتب ترتیبًا، قدم

فیہ ما حقہ ان یقدم، واخر فیہ ما حقہ ان یؤخر۔ اخرض یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے۔ وہ آخری جگہ پائے عہد اجتماع وائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام ایک مرکز ایک سلسلے ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور تمام مواد، قوٰی، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی اور انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ بجز یکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہمد گر جڑا اور ملا ہوا۔ ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی۔ ہر فرد زنجیروں کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے، تو اسی سے تخلیق و تکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ "تخلیق" و "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا ہے الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۔ پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع وائتلاف، اور موت و فنا نہیں ہے۔ مگر اس کی ضد یہی حالت جب اعمال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو "خیر" اور شریعت کی زبان میں "عمل صالح" اور "حسنات" کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں "تندرستی" سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ زندگی ہے اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام "حیات قومی و اجتماعی" ہوتا ہے اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور ظفر و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں۔ معنی ایک ہے مظاہر گو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح۔ اس کا قانون حیات و وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے۔ ولنعم ما قیل

عبارا تنا شتی و حسنک واحد
و کل الی ذاک الجمال یشیر

اس حالت کی ضد اشتات و انتشار ہے۔ "اشتات" "شتت" سے ہے جس کے معنی لغت میں "تفرق" اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں " یقال شت جمعھم شتا و شتاتا - ای متفرق المنظام رد مفسر دات " قرآن حکیم میں ہے یومئذ یصدر الناس اشتاتا - اور من نبات شتی اور وقلوبھم شتی لے مختلفہ انتشار "نشر" سے ہے اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفریق کے سوء جمعہ میں ہے۔ فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا ، یعنی تفرقوا "اشتات وانتشار" سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع وائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جائے، تفرق اور پراگندہ ہونے اور باہمد گر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مواد میں، قوی میں اعمال میں، افراد میں۔ ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے "تکوین" کی جگہ "فساد" اور "وجود" کی جگہ "عدم و فنا" اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے "بیماری" اور پھر "موت" ہے اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں "عمل سو" اور "عصیان" سے تعبیر کرتا ہے اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا "اجتماع وائتلاف" کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لئے انسان کے لئے اللہ کی جانب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو "اعتصام بحبل اللہ" اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے

مسلمانوں سے اولین مخاطبین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم کو ذریعہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو۔ سب کے ہاتھ اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے تم سرفراز کیے گئے! تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقا و قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے جس کے دہکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی کوئی زندگی نشوونما نہیں پا سکتی۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔

اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دہکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھولتا ہے تاکہ کامیابی کی راہ پا لو۔

یہ بھی جا بجا بتلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر و حکمت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق اور رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔	کو محبت و اتحاد ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کے فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

اور اسی لئے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزولِ وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہوا اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور اسی لئے یہ نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان اور اسکو بالکل ترک کر دینے کا ہے۔ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَھُمُ الْعِلْمُ۔ وَاٰتَیْنٰھُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ، فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ ط وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔

اور اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے اسلام یعنی اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "موت جاہلی" سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ آگے بالتفصیل آئیگا من فارق الجماعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ، وغیرہ ذالک اور اسی بنا پر کثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ امیر غیر مستحق ہو۔ نا اہل ہو۔ فاسق ہو۔ ظالم ہو۔ کوئی ہو۔ بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے (ما اقاموا الصلوٰۃ) اور ساتھ ہی تبلا دیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے علیحدگی کی راہ اختیار کی۔ تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا۔ یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کیلئے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی ہو تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا حکم رکھتی ہے۔ جسکو انگوٹھے سے مس دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلعم سے روایت کرتے علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد" دوسری روایت میں ہے "فان الشیطان مع الواحد"۔ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو ہمیشہ

جماعت بن کر رہو، کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا - دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان اُن سے دور ہے یعنی اتحادی و جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی - اب وہ راہِ حق سے نہیں بھٹک سکتے - یہ الفاظ مشہور خطبہ جابیہ کے ہیں جو عبداللہ بن دینار، عامر بن سعد، سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا کہ انھوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا - اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی "علیکم بالسواد الاعظم، فانہ من شذ شذ فی النار" اور "ید اللہ علی الجماعۃ" اور "لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ" او کما قال اور خطبہ حضرت امیر کہ "وایاکم والفرقۃ، فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب - الا من دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھذہ!" وغیرہ ذلک اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں - آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہو کر رہو، جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے - افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہو سکتی - اس پر اللہ کا ہاتھ کبھی ایسا ہونے نہ دیگا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے -

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نا اہل ہو - لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا حتیٰ کہ "صلوا خلف کل بر و فاجر" تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی ہے - انفراد و فرقہ ہر حال میں بربادی و ہلاکت - پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے -

اور یہی سبب ہے، کہ سورۂ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھلائی گئی - اس میں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی "اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ" فرمایا "اِھدِنِی" نہیں کہا گیا یہ اسی لیے کہ قرآن کے نزدیک -

فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہے تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو اور اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصۂ قرآن و عصارۂ اسلام ہے۔ جتکلم جمع کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا سکھلائی گئی وہ بھی بصیغۂ جمع آئی۔ اگرچہ مخاطب واحد ہو یعنی السلام علیکم ہم السلام علیک نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی "السلام علیکم" بصیغہ جمع رکھا گیا۔ واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ علت اس کی یہی ہے۔ نہ کہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و ایتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع کے اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال واندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دے دینا ہے۔ علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بد قسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفہ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو اسی کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا۔ تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا۔ زکوٰۃ کا بھی ہونا چاہیے۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے۔ جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے۔ جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے " مثل المؤمنین فی توادھم و تواقفھم کمثل الجسد الواحد۔ اذا اشتکی منہ عضو، فتداعی لہ سائر

ما اشتكى الجسد بالسهر والحمى" (صحیحین) اور "المسلم للمسلم كالبنيان يشد بعضه بعضا" (بخاری)

یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضا۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو اور ان کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی۔ پھر تشبیک اصابع کر کے اس کی تصویر بتلادی۔ یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلادیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ سباق تمام تصریحات میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں۔ دیوار کا نام ہے الگ الگ اینٹ کا کوئی اور مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا نام ایک جزء ہے اور انہی اجزا کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے۔

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۂ صفوف پر سخت زور دیا گیا یعنی صف بندی پر اور سب کے سروں، سینوں اور پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر "لتسوون صفوفكم او ليخالفن الله بين وجوهكم" (بخاری) اور روایت انس کہ "سووا صفوفكم فان تسوية الصفوف من اقامة الصلوة" (بخاری) وفی لفظ "من تمام الصلوة" تو اس میں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقع نہیں قرآن و سنت کی تصریحات و حکمیات اس بارے میں اس کثرت سے اور محتاج تفسیر و کشف ہیں کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب۔

اسی قانون الٰہی کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی و عروج کا اصلی دور وہی تھا جب ان کی نظامی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی پر اجتماع و ایتلاف کی روح طاری تھی اور ان کے تنزل و ادبار کی اصلی بنیاد اسی دن پڑی جب اجتماع و ایتلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست چھانی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا۔ ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی ہر چیز بندھی ہوئی تھی۔ لیکن بتدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ پھیلا

ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون تنزلِ اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشہ وجود و عمل پر برابر طاری ہوئی اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گذر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسبابِ تنزلِ امت پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی علتیں ٹھہراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام مفاسد و نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں۔ اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو مگر اصلی علت اس کے سوا کوئی نہیں۔

قوتوں کے انتشار کا دَور ساری چیزوں پر طاری ہوا لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک داعیِ شریعت یا حاملِ وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی، بلکہ ان ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قویٰ کی جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں، اور جن کا آپ کے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستاں شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ دکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے۔ بلکہ سچی حکومت و سلطنت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا، جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا۔ شریعت کا مقنن تھا۔ اُمت کا بانی تھا۔ ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر قوموں اور چال

سے بنی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت وہدایت کا واعظ تھا۔ تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدانِ جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالارِ لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح وطلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی رد کرتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے، اور اسلام کا نظام دعوت بھی تھا کہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفائے راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قویٰ ومناصب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اس کو "منہاج نبوت" سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوت کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

منصبِ نبوت مختلف اجزاءِ نظر وعمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزء وحی وتنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع وتاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسئولانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی۔ اور قیامت تک کے لیے شریعت وقانون کے وضع وقیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا۔ نہ کہ تکمیل کا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵: ۴)

لیکن منصبِ نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے طبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا اور ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ اس جزء کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمر کے لیے "محدث" (بالفتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث

کہا گیا۔ مبشراتِ صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا لم یبق من النبوۃ إلا المبشرات" حدیثِ تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفائے راشدین کو جو نیابت پہنچی اس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اور تمام اجزء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ داعیِ اسلام کا وجودِ نبوت کے ساتھ خلافتِ ارضی، حکومت و سلطنت نظام و قیامِ سیاست، قیادتِ فوج و حسب فتح و عمران ممالک، ریاستِ مجالسِ شوریٰ وغیرہ جہانبانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا۔ اس لیے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافتِ خاصہ میں بھی خلفائے راشدین کا تنہا وجود اُن ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحبِ امامت و خلافت بھی تھے۔ صاحبِ اجتہاد و قضا بھی تھے اور صاحبِ سیاست و نظامِ احکام و بلاد بھی۔ اصلاً "امامتِ کبریٰ" کا مقام اجتہادِ دینی اور سیاستِ ملکی دونوں سے مرکب ہے اس لیے ان کی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔ حضرت عمرؓ مسجد کے دارالشوریٰ میں مسائلِ شرعیہ کا بحیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے۔ عدالت میں مقدمات سنتے تھے اور دیوانِ فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے۔ اگر وہ نمازِ جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے۔ تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدانِ جنگ میں احکام بھی وہی بھیجتے اور روم کے سفیر کو بحیثیت شہنشاہِ اسلام اپنے سامنے بھی بلاتے۔

اِس طرح نبوت کا مقام تعلیم و تربیتِ امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا قرآن حکیم نے اُن کو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ، وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

تلاوتِ آیات۔ تزکیہ نفوس۔ تعلیم کتاب و حکمت۔ خلفائے راشدین ان تینوں منصبوں میں وجودِ نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصبِ اجتہاد و قضاءِ شرع کے ساتھ قوتِ ارشاد و تزکیہ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ وحی کی طرح خدا کے کلام کی

منادی کرتے۔ ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکی بخشتے اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہؒ و شافعیؒ بھی تھے اور جنیدؒ و شبلیؒ بھی نخعیؒ و حمادؒ بھی تھے اور ابن معینؒ اور ابن راہویہؒ بھی، جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ دلوں کی حکمرانی بھی ان ہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں اور اسی لیے ان کا وجود اور ان کے اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ "علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین" اور اسی لیے "وعضوا علیہا بالنواجذ" کے حکم میں نہ صرف سنت عہد نبوت بلکہ خلافت راشدہ خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی۔ اور شرح اس سر الٰہی کی بہت طولانی ہے یہاں محض اشارات مطلوب۔

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دے دی گئی تھی۔ اجتماع و ایتلاف کی یہ حالت حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ از انجملہ مرکزی قوتوں اور منصوبوں کا انتشار و اشتات تھا۔ جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی داخلی درہم برہم کر دیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یک جا قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں ان کا ظہور اور نشوونما ہوا۔ حکومت و فرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر مجرد بادشاہی کی شکل میں آ گیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا: "الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم ملک" سو واقعی اس کے بعد صرف بادشاہی رہ گئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم و ترتیب روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہو گیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض بادشاہی کے لیے اور فقہا کا مجرد استنباط احکام و مسائل کے لیے رہ گیا۔ تو تزکیۂ نفوس اور ارشاد قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی

اور اس طرح اصحابِ طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی پہلے صرف ایک وجود تھا وہ بادشاہ، مجتہد، مرشد، قاضی القضاۃ، سپہ سالارِ جنگ، امیرِ عدل و احتساب سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفقہ کیلئے دوسرا وجود مرکز بنا قضا کے لیے تیسرا۔ ارشاد و تزکیۂ قلوب کے لیے چوتھا۔ وھلم جرّاً غرض کہ عہدِ اجتماعِ قویٰ و مناسب کے بعد دورِ انتشارِ قویٰ و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمالِ ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بے گانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک وجود میں جمع تھیں یا اب مختلف وجودوں میں بٹ کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلافِ تعدد و تنوع ہی نہیں رہا۔ بلکہ اختلافِ تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سرمست ہو۔ افسوس کی سطحی و غیر ذی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسبابِ ترقی و تنزل پر تدبر کرتے۔

غرض کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جو سلسلۂ خلافت قائم ہوا۔ وہ خواہ قرشی رہا ہو یا غیر قرشی، مجرد ملوکی و بادشاہی کا سلسلہ تھا اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے (جیسا کہ عہدِ حضرت عمر بن عبدالعزیز) یہ نیابتِ نبوت کے اور تمام اجزاء سے یک قلم خالی رہا منصب بٹ چکے تھے۔ قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطینِ عثمانیہ کی خلافت طریقِ استبدادی و شخصی سے شورائی میں تبدیل ہو گئی۔ سو بلاشبہ خلافتِ راشدہ کی طرف عود و رجعت کا یہ ایک مبارک قدم تھا جس کیلئے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص بر دور اور ہر سلسلے کے وہی رہے جو ایک جامع لفظ

عضو عضو" میں بتلا دیے گئے تھے۔ اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائیدار تبدیلی نہ ہوئی۔

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفۂ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر۔ جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جز اور قوام ہستی کی زنجیر فطرت کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک قوت بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں۔ یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے علیحدہ ہو جائیں تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا ہے کہ "الحقیقۃ کالکرۃ" اور صاحب فتوحات نے کہا "دائرۃ قاب قوسین" ہے۔

یہ قانون مرکزیہ و دائرہ نظام ہستی کے ہر عضو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے۔ ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم کیا ہے، کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے اسی قانون مرکزیہ پر متحرک ستاروں کے حلقے اور دائرے ہیں۔ ہر دائرہ کا نقطۂ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے کعبۂ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ

کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ

خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف اور انقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف و دوران کیلئے حکمتِ الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک زمانہ قرار دیدیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ سب بحکم وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اور اِنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

قانونِ مرکزیہ کا یہ پہلا بلند ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اتر تے آئیں گے اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے۔ ہر جگہ زندگی اور بقا اِسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو۔ اس کی مجتمع وحدت کثرت سے مرکب ہے۔ ڈالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں۔ پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہو گئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ۔ اور خود اپنے وجود کی طرف دیکھو جس کو دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے، جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے۔ جو تم میں آباد ہے۔ ہر قسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ۔ لیکن دیکھو یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے، سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اذا صلحت صلحت کلها، واذا فسدت فسدت کلها۔

اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اگر نوعِ انسانی کی سعادت و ارتقا کے لیے قانونِ اسلام اسی فاطر السموات والارض کا بنایا ہوا ہے۔

جس نے تمام کائنات کے لیے قانونِ حیات بنایا۔ تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو۔ بلکہ پہلا قانون پچھلے قانونِ عام کا ایک ایسا قدرتی جزء نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی پس اسلام کا نظامِ شرعی بھی ٹھیک اسی قانونِ مرکزیہ پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقا بھی قانونِ مرکزیہ پر موقوف ہے جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کا بھی مرکزِ سعادت انبیائے کرام کا وجود ہے پس ان کی اطاعت و انقیاد بقاء و حیات کے لیے ناگزیر ٹھہری وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اسی لیے فرمایا فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ پھر قوم و ملت کے بقا کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدۂ توحید کو ٹھہرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ عبادات میں نماز کو مرکزِ عمل ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرۂ اعمال منہدم ہو جاتا ہے "فمن اقامها فقد اقام الدین فمن ترکها فقد هدم الدین" اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ "کان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکه کفر غیر الصلوٰة" (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکزِ سعادت وادیٔ حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا جعل اللہ الکعبة البیت الحرام قیاما للناس "قیاما للناس" پر غور کرو۔ اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا۔ اس لیے تمام دائرہ کا رُخ بھی اسی طرف ہوا

خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کے لیے مراکز قرار پائے، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہٰذا وہ مرکز بھی قرار دیدیا گیا۔ تمام اُمت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت اس کی حرکت پر حرکت، اس کے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک اس کی دعوت پر انفاقِ جان و مال، ہر مسلمان کے لیے فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام "خلیفہ" اور "امام" ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی
أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ	اس کے رسول کی اور تم میں جو
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ج فَإِنْ	اولوالامر ہو۔ اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ
تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ	میں تم مختلف ہو جاؤ، تو چاہیے کہ
إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ	اللہ اور اس کے رسول کی طرف
تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط	لوٹ اور اس کے فیصلے پر متفق
ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۔	ہو جاؤ۔

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولوالامر ہو اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولی الامر، تو نہایت قوی و روشن

وجوہ موجود ہیں۔ کہ اولوالامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظامِ اُمت قائم رکھنے والا، تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے۔ اولاً، بحکم "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" اور اولوالامر کی تفسیر خود قرآن ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے اسی صورت میں آگے چل کر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ	اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر اُن تک
الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ	پہنچتی ہے تو بلاسوچے سمجھے لوگوں میں
وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى	پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ اللہ کے
اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ	رسول کی طرف اور اُن لوگوں کی طرف
یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (۴: ۸۳)	رجوع کرتے جو اُن میں اولوالامر ہیں تو

فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا پتہ لگا لیتے۔

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جب امن و خوف یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں اور بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب و غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی وجہ سے عہد نبوی میں پیش آجاتی تھیں۔ پس فرمایا کہ جب کوئی افواہ سنو تو پہلے اللہ کے رسول اور اپنے "اولوالامر" تک پہنچاؤ تاکہ وہ اس کی صحت اور عدم صحت کی تحقیق کر لیں اور خبر کی نوعیت اور راویوں کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج کا استنباط کریں۔ ایسا نہ کرو کہ جہاں کوئی افواہ سنی فوراً اس پر یقین کر لیا اور لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ اس آیت میں "اولوالامر" سے مقصود کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ ذکر امن و خوف کے حالات کا ہے یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کا۔ ان حالات کا تعلق صرف حکام و امرائے ملک سے ہی ہو سکتا ہے علماء و فقہاء سے نہیں ہو سکتا معاملہ نظمِ ملک و قیامِ امن کا ہے۔ استنباطِ مسائل اور حلال حرام کا نہیں ہے۔ پس

لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اولوالامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپرد ملک کا انتظام اور جنگ دامن کا نظم ونسق ہوتا ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں جن کا اثر ملک کے امن وخوف پر پڑ سکتا ہے یعنی ارباب حکومت وامارت۔

ثانیاً۔ کتاب وسنت اور صدر اول کے آثار عربیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ امر جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے جیسی کہ یہاں ہے تو اس کا اطلاق عموماً حکومت وسلطنت ہی کے معنوں پر ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے موجود ہے کہ ایک صاحب نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ "امر" کے معنی حکم کے ہیں اور "اولی الامر" کے معنی امام بخاری نے ذوی الامر کے کیے ہیں یعنی "حکم والا" پس معلوم ہوا کہ صاحب حکم وہی ہو سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

ثالثاً۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت اتری وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا بخاری ومسلم میں ہے عن ابن عباس نزلت فی عبد اللہ بن حذافۃ بن قیس بن عدی اذ ابعثہ النبی صلعم فی سریۃ" اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کی باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا ان کے حکم کے ایک شخص مزدوری پر رکھ لیا تھا۔ نزلت فی قصۃ جرت لعمار مع خالد وکان خالد امیرا فاجار رجلا بغیر امرہ فتخاصما، دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت وعدم اطاعت کا تھا۔ نہ کہ احکام ومسائل کے حکم وافتاء کا۔

رابعاً۔ اکثر اقوال مرویہ صحابہ وتابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ صدر اول میں صرف یہی تفسیر مشہور ومعلوم تھی۔ بہت سی موشگافیاں جو پیدا کی گئی ہیں۔ سب بعد کے مفسرین کی طبعزاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے عیینہ کا قول نقل کیا ہے "سالت زید بن اسلم عنہا ولم یکن بالمدینۃ احد یفسر القرآن بعد محمد بن کعب مثلہ

فقال اقرأ ماقبلها تعرف۔ فقرأت :۔ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" فقال ھٰذہ فی الولاۃ

یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا۔ میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ اس آیت سے ماقبل آیت پڑھو میں نے پڑھا "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" پس کہا کہ مقصود اس سے حکام ہیں۔ یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت وقضا کا ہو رہا ہے پس اولوالامر سے مقصود وہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں۔ طبری نے لسند صحیح حضرت ابوہریرہ اور میمون بن مہران وغیرہ سے نقل کیا ہے ہم "الامرا" اور علامہ ابن حزم نے ان تمام صحابہ وتابعین کو شمار کیا جن سے یہ تفسیر منقول ہے قرتیرہ سے زیادہ ثابت ہوتے۔ باقی رہا بعض صحابہ تابعین کا یہ کہنا کہ مقصود اہل علم و نظر ہیں یعنی جابر بن عبداللہ کا قول کہ "ھم اھل العلم والخیر" اور مجاہد وعطاء وابوالعالیہ کا قول کہ "ھم العلماء" تو ان اقوال میں اور صحابہ کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے در اصل اسلام کا نظام حکومت وجماعت تو یہی تھا کہ حکومت وولایت کا منصب تمام شرعی اور علمی قوتوں سے مرکب ہوا اور اس وقت تک قوتوں کے انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں۔ جو شخص والی ملک اور حاکم مسلمین ہوتا تھا وہ بدرجہ اولی عالم و فقیہ بھی ہوتا تھا۔ پس جن صحابہ وتابعین نے "اولوالامر" کی تفسیر میں علم وخیر کا ذکر کیا۔ انہوں نے واقعی بہت صحیح تفسیر کی۔ گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولوالامر ایسے ہی افراد کو ہونا چاہیے۔ جو اہل علم وخیر ہوں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولوالامر سے مقصود علماء وفقہا کا وہ مخصوص و متعارف گروہ ہے جو اسلام کے نظام جماعت کے انقراض کے بعد پیدا ہوا اور جس کا صدر اول کے مفسرین کو وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا؟

امام ابن جریر نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے "ابوبکر و عمر" اس سے بھی ان کا مقصود

یہی ہے کہ اولوالامر مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما

اصل یہ ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے حجاز میں ایک طرح کی باقاعدہ طوائف الملوکی قائم تھی اور مکہ میں قریش کا قبیلہ بالکل خود مختار اور غیر مسئول تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو اس نے "جماعت" اور "امارت" کے نظام پر زور دیا اور بڑے بڑے گردن کشوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اطاعتِ امیر و التزام جماعت سے باہر نہ ہوں۔ قریش کی نسلی فطرت اس اطاعت کیشی کے خلاف تھی۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کو اس بات کا خوگر بنانا تھا۔ حافظ عسقلانی نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ وَرَجح الشافعي الاول واحتج بان قريشا كانوا لايعرفون الامارة ولاينقادون الى امير، فامروا بالطاعة لمن ولى الامر، ولذلك قال صلعم، من اطاع اميري فقد اطاعني -

خامساً۔ تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ یعنی امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے "اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" اور اس میں حضرت ابوہریرہ کی روایت درج کی ہے "من اطاع اميري فقد اطاعني" الخ، جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اس نے خود میری اطاعت کی جس نے اس سے انکار کیا، اُس نے خود مجھ سے انکار کیا، اس سے معلوم کہ ان کے نزدیک اولی الامر کی اطاعت سے مقصود امیر و امام ہی کی اطاعت ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں "فی هذا اشارة من المصنف الى ترجيح القول الصائر الى ان الاية نزلت فى طاعة الامراء خلافا لمن قال نزلت فى العلماء"۔

سادساً۔ سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے اور اصحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ و نظر معلوم، انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کر کے ترجیح اسی تفسیر کو دی ہے۔

سابعاً۔ اس نقطہ پر نظر رہنی چاہیے کہ تفسیر قرآن کے معاملہ میں جس قدر اختلافات

کی کثرت اور مذہب و طرق و تنوع نظر آتا ہے وہ تمام تر متاخرین کی فلسفیانہ کاوش پسندی کا نتیجہ ہے جبکہ معقولات کے شیوع اور یونانیت کے غلبہ و احاطہ سے علوم دینیہ میں اس "تعمق" کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں۔ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "ھلک المتعمقون" فکر و نظر میں عجمیت کے ظہور، عربیت خالصہ و صالحہ کے بعد اور علوم سنت کے ترک و ہجر نے اس معاملہ کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اوائل اور سلف میں یہ تمام اختلافات یک قلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے۔ جو عربی لغت و محاورہ میں ہو سکتے ہیں اور سب لوگ اس پر قانع تھے۔ ابداع معانی کثیرہ اور تفحص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کاوش ہی نہیں کی جاتی تھی نہ فرضی و تخمینی شکوک و ایرادات گھڑ کر نئے نئے معانی فرض کیے جاتے تھے۔ "اولوالامر" کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائے گا جس کی عربیت خالص و صحیح ہو تو صرف ایک ہی معنی اس کے ذہن میں آئیں گے یعنی صاحب حکومت۔ کسی دوسرے مفہوم کا اسے وہم بھی نہیں گزرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے۔ لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ امکانی مطالب کا وسیع سے وسیع میدان ڈھونڈتے ہیں اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کے لیے اختیار کر لینا چاہتے ہیں۔ پس متاخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو اور لغت اور عربیت اس کی تصدیق کرے۔ متاخرین کی کاوشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تفنن ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے لیکن تفسیر قرآن نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو حامل قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو اور ان لوگوں نے بتلائی ہو جن کے علوم و عمل پر خود اللہ نے اپنی رضا و پسندیدگی کی شہادت دی ہے "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" اگر سلف سے اعراض و انکار اس بنا پر ہے کہ وہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے نا آشنا تھے تو کم از کم قرآن کا علم تو ان کے لیے

چھوڑ دینا چاہیے یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل تو ہوا محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر۔ لیکن اس کے معانی و مطالب اس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہوں جب تک ارسطوئے یونانی اُن کی رہنمائی نہ کرے!

امام رازی وغیرہ کو زیادہ حیرانی اس بنا پر ہوئی ہے کہ اولوالامر کی اطاعت کا ذکر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عطف تسویہ پیدا کر رہا ہے۔ پس اولوالامر ایسا ہونا چاہیے جس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہو۔ سلاطین و امرا کو یہ منصب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن و سنت قانون ہے۔ لیکن قانون بالکل بے کار ہے اگر کوئی قوت نافذہ نہ ہو۔ یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت اور ظاہر ہے کہ جو قوت نافذہ ہوگی، اس کی اطاعت عین قوتِ مقننہ کی اطاعت ہوگی۔ ایک دہقانی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت عین بادشاہ کی اطاعت ہے بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین قانون اور بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنا عین قانون اور بادشاہ سے بغاوت کرنا۔ یہ ساری بحثیں اس لیے پیدا ہو گئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی گئی۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوتی کہ شریعت کے نفاذ اور اُمت کے قوام و نظام کے لیے ایک مرکزی اقتدار ناگزیر ہے اور وہی امام اور اس کے نائب امراء ہیں۔ اولوالامر کا مطلب بالکل صاف تھا۔ کسی کاوش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فان تنازعتم الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ ارضی خلیفہ نہیں ہے۔ آسمانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ لیکن اسلامی خلافت کی اصلی بنا خلافتِ ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت اور اُمت کی حفاظت کرنے اور احکامِ شریعت نافذ کرنے والا ہے یعنی محض ایک قوتِ نافذہ ہے نہ کہ مقننہ۔ اس کی ذات کو اصل شریعت اور اس کے احکام

میں کوئی دخل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو "فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس میں نزاع و اختلاف پیدا ہو۔ تو پھر اس کے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز اولی و حقیقی کا یعنی قرآن و سنت کا اور خود خلیفہ بھی اس کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد۔

یہی وجہ ہے کہ اطیعوا اللہ کے بعد پھر اطیعوا الرسول میں فعل کا اعادہ کیا گیا مگر "اولی الامر" میں نہیں کیا گیا، تاکہ واضح ہو جائے کہ اصل اطاعت جو مطلوب ہے وہ اللہ کی ہے یعنی کتاب و سنت کی اور اولوالامر کی اطاعت صرف اسی لیے ہے تاکہ کتاب و سنت کی اطاعت کی جائے۔ بالاستقلال نہیں ہے پھر "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ" کہہ کر اور زیادہ واضح کر دیا کہ اگر اولوالامر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے تو پھر اس حکم میں ان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ہی کے حکم کی طرف لوٹنا چاہیے۔ قالہ الطیبی فی الشرح۔

بعض امرائے بنو امیہ نے اپنے مظالم و بدعات کی اطاعت کرانے کے لیے جب اس آیت سے استدلال کیا اور کہا "الیس اللہ امرکم ان تطیعونا فی قولہ واولی الامر منکم" کیا خدا نے تم لوگوں کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا کہ "واولی الامر منکم" تو بعض ائمہ تابعین نے کیا خوب جواب دیا کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ بھی ہے، مگر پھر اس منصب سے تم محروم ہی تو کر دیے گئے جب فرمایا: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔

غرض کہ اس آیہ کریمہ میں قرآن نے اس قانون شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اور وہی وجود نظام جماعت کا مرکزی اقتدار ہے۔

احادیث صحیحہ میں اس کی جو توضیح و تفصیل ہوئی ہے اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات روات و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے

بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی

اسلام کا نظام عمل، پانچ عالمگیر صداقتیں۔ ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم:-

انا آمرکم بخمس، اللہ امرنی	یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے
بھن: الجماعۃ والسمع، والطاعۃ	لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے دیا
والھجرۃ، والجھاد فی سبیل	ہے جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور
اللہ۔ فانہ من خرج من الجماعۃ	اللہ کی راہ میں جہاد، یقین کرو کہ جو مسلمان
قید شبر، فقد خلع ربقۃ	جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا
الاسلام من عنقہ إلا ان	تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے
یراجع، ومن دعا بدعوی	نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی
الجاھلیۃ فھو من حثی جھنم	کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف
قالوا یا رسول اللہ وان صام	بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے
وصلی؟ قال وان صلی وصام	عرض کیا کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ
وزعم انہ مسلم۔ اخرجہ	روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا
احمد والحاکم من حدیث	ایسا شخص جہنمی ہے اگرچہ روزہ رکھتا ہو
الحارث الاشعری علی شرط	اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں
الصحیحین۔ قال ابن کثیر ھذا	اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔
حدیث حسن ولہ الشواھد	

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں:-

اب پہلی چیز "جماعت" ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیے آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا کسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور رہی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔

"اتحاد" سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پا جائیں۔ کسی گوشہ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف" کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے "اتحاد" صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن "ائتلاف" سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی جگہ اُسے ملی ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور عمر کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو سیر بھر قرار دیدیا جائے۔

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماع مزاج جس

قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا ہی مزاج اُس کے ساتھ ملایا جاسکے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہمدگر میل نہیں کھا سکتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ۔ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں باہم مل کر ایک جان نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اس لیے پیدا کیا۔ باہم دگر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں اسی طرح افرادِ انسانی کو بھی اس لیے پیدا کیا تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ جماعت "ایک مرکب وجود ہے افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا محض ایک ٹکڑا ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ نگینہ اسی انگشتری کے لیے تھا!

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و ترکیبی حالت ہے۔ جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم۔ اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد و مؤتلف، ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک "امام" کا وجود ناگزیر ہوا اور اسی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کر لیں جو بکھرے ہوئے اجزا کو اتحاد و ایتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور الگ الگ ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے اور پھر ہر ملک، ہر آبادی، ہر گروہ میں اس کے ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی ترکِ جماعت جائز نہیں

کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں۔ حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کر لیا جائے "اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیومروا احدھم"

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلا دیا گیا۔ کیونکہ نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کا جامع ترین نمونہ ہے کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں، مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں آتے ہیں۔ لیکن یکایک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزا کا یہ منتشر مواد بالکل ایک ہی جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کا وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں، سب کے چہرے ایک ہی جانب۔ قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں۔ جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بیک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد و ممزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو۔ سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم، پھر دیکھو سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال و افعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکا دے جب چاہے سب کو اٹھا دے۔

اسلام کی زبان میں "جماعت" سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبوہ اور بھیڑ کا نام "جماعت" نہیں ہے۔

جماعت کے جن اوصاف و خواص کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ تمام تر قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن شواہد کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

۲۔ دوسری چیز "السمع" ہے۔ یعنی امام جو احکام دے۔ اس کو سننا اور اس سے تعلیم ارشاد حاصل کرنا "سمع" کے لفظ میں قبولیت احکام و طلب تعلیم، دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

۳۔ تیسری چیز "طاعت" ہے۔ یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ طاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں "انما الطاعة فی المعروف"۔

۴۔ چوتھی بات "ہجرت" ہے۔ ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں "الہجرة والہجران مفارقة الانسان غیرہ اما بالبدن او باللسان او بالقلب۔ والمہاجرة مصارمة الغیر و متارکتہ" اسلام کی اصطلاح میں کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصدِ اعلیٰ کے لیے اپنی دنیوی محبوبات و مالوفات ترک کر دے مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز و اقربا کے قرب کو وطن و مکان کو، تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیرو دل کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی "انی مہاجر الیٰ ربی" اور "انی ذاہب الیٰ ربی"۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال مال و متاع، دوست و احباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت والفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے۔ اس لیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی۔ اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تارکینِ وطن ہی پر کیا گیا۔ "و لکل امرئ مانوی۔ فمن کانت ہجرتہ الی اللہ و رسولہ فہجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کانت ہجرتہ لدنیا یصیبہا، او امرأة یتزوجہا، فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ" (بخاری عن عمرؓ) یعنی ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی۔ اور جس نے اس لیے گھر چھوڑا کہ دنیا کمائے یا نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوئی جس کے لیے اس نے گھر چھوڑا۔ پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب بعضہا فوق بعض کتاب و سنت اس کی تفصیل سے لبریز ہیں یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

۵ ۔ پانچویں چیز جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد "جہد" سے ہے جس کے معنے "استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو ظاہرًا او باطنًا" ہیں۔ (مفردات راغب) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لئے انتہائی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی ہوتی ہے، جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے وَجَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ (رواہ ابو داؤد، و احمد و نسائی، و ابن حبان عن انس)۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقا و قیام کی اصلی بنیادیں ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے۔ مگر کوئی چیز بھی بغیر جماعت، اطاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے غور کرو گے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔

دنیا کے تمام تر نزاعات و اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہ عمل میں حقیقت و مسمی کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے اور گو سب طلبگار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم دگر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے: شہد۔ دوسرا کہتا ہے عسل۔ مگر کوئی جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے، اختلاف مسمی میں نہیں ہے صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب و روز ایک حقیقت کو

اتنا اور جانتا ہے یعنی اپنی اصطلاح ورسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے، اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلاف سے لے کر معاشرت ورسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر و اسماء کے تمام پردے اٹھا دیے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے اگر چہ بھیس مختلف ہیں اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت ہیں:۔

عبارا تنا شتیٰ وحسنک واحد
وکل الی ذاک الجمال یشیر

علوم و حقائق کے مشاہد و مناظر میں یہ مشہد سب سے اعلیٰ و ارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "علم الجمع بین المختلفات" سے تعبیر کرتے ہیں[1] اور عامۂ اصحاب اشارات و سلوک نے "مشہد وحدت" کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کے لیے کشفِ حجب اور سیرِ حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوتِ نظر و فکر ہے جو ظاہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جائے اور اسماء و تعبیرات کے اختلافات دور کر کے مقاصد و معانی کا اتحاد معلوم کر لے بجز یکہ سارے نزاعات و اختلافات دور ہو جائیں اور سخت سے سخت متنازع و متضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل مطلوب دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت، تعلیم،

---

[1] تفہیمات میں لکھتے ہیں:۔ "لما تمت بی دورۃ الحکمۃ البسنی اللہ خلعۃ المجادیۃ فعلمت علم الجمع بین المختلفات"۔

اطاعت، ہجرت اور جہاد دُنیا کی وہ عالم گیر صداقتیں ہیں جن کی حقیقت سے کسی فرد وبشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے، ہر دل میں انکا اعتقاد موجود ہے، اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے، ان سے دنیا کو اختلاف ہے لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی، اگر کرے تو زندگی اور مردمی سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز "جماعت" ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گزر چکی۔ غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے، جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے؟ جماعت کی زیادہ سے زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو۔ صاف اور سیدھے سادے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہیں پر غور کر لو۔ سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ "جماعت" اور "انتظام جماعت" ہو، حتیٰ کہ قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل جل کر اپنے معاملہ کا فیصلہ کرتے ہیں پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سربراہ اور رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو تو سب سے پہلے ایک پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے۔ اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں! اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو! خود تمہارا گھر بھی ایک چھوٹی سی آبادی ہے،

اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو؟ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں تو تم کیوں لڑتے ہو؟ اگر کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں رو ز خانہ جنگی ہوتی ہے یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ "الجماعة، والسمع والطاعة" کوئی جماعت امن و نظم نہیں پا سکتی جب تک اس کا کوئی امیر نہ ہو اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے تم گھر کے بڑے ہو۔ یعنی امیر ہو پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہنے پر چلیں۔

"ہجرت" کا لفظ کس قدر تمہارے لیے نا آشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہدِ جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک قربان کر دیتا تھا۔ لیکن بتلاؤ اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ "ہجرت" کی حقیقت سے کب خالی ہیں؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرۂ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ "ہجرت" سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصولِ مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسیاتی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے مل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے اس نے پائی ہو؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائلِ معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن و سعت، فی الحقیقت

انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کچھ نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسان کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے، اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش، اہل و عیال کی محبت، خویش و بیگانہ کی الفت اور ملک و وطن کی دامنگیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے، تو آج دنیا میں علم کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پیٹھ پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولۂ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا؟ کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں۔ دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے، جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویہ و اشیاء کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارا نہ کر لیتے۔ تو اشیاء کی تحقیق کیونکر ہوتی؟ پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتی؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں؟ نئی نئی ایجادات و اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک و واشنگٹن کی سر بفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت ان کے گھروں میں کھنچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں، تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال، اور جذبۂ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے۔ تو تم اس کا انکار کر دو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے

کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترکِ وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کششِ ثقل" کا قانون دریافت کرے، تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر تم عزم و طلب کے ایسے ہی پرستار ہو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانونِ کششِ ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانونِ نجاتِ عالم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے۔

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد "کالونیل سسٹم" کو یقین کرتا ہے۔ یعنی نوآبادیوں کے اصول کو، اور اس کا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ و قتال میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نوآبادیوں کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ ترکِ وطن کرکے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا اور قومی دولت و طاقت کو بڑھانے کے لیے دنیا میں دور دور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو کہ یہ وہی "ہجرت" اور ترکِ وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور "الجماعۃ، والسمع، والطاعۃ، والھجرۃ" پر دنیا عمل کر رہی ہے یا نہیں۔ نام مختلف ہیں۔ مگر حقیقت ایک ہی ہے۔

"جہاد" کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ اور قائم نہیں رہ سکتی؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا۔ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزارِ ہستی میں بقاء و قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقا Struggle for Existence اور انتخاب طبیعی Natural Selection اور بقاء اصلح Survival of the Fittest کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزارِ حیات میں بقا صرف اصلح و اکمل

کے لیے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو اور فطرت کے قتل و غارت کا فسانۂ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن و اسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانونِ الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے؟ پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانونِ الٰہی کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں۔ یظھرہ علی الدین کلہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانونِ ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارت گری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نوآبادیوں سے بھر دیں اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کے حقدار ہیں۔ اس کو تو تم گوارا کر لو۔ لیکن اگر اسلام کہے کہ ان الارض للہ و رسولہ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے، تو تم اس کو وحشت اور خونخواری کہو۔

یہاں ایک اور اہم اور قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث (حدیث حارث اشعری) اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعتِ خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے برعکس کو جاہلیت۔ جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علیحدگی۔ اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا۔ اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و ائتلاف۔ تمام منتشر افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفسِ واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیے وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا الخ

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا۔ اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت،

یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعتِ امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

مسلمانانِ ہند اور نظام جماعت

اس بارے میں مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکھٹے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں کمیٹیاں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں "بھیڑ" اور "انبوہ" کا حکم رکھتی ہیں "جماعت" کا حکم نہیں رکھتیں۔ "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد ایک حیثیت اور ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں، وہاں ان کے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے افراد و اشخاص کوئی شے نہیں جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں لیکن یہ گرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں، اور وہ قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکلخت برباد نہیں کر دیتے

اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے خود فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

• شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے۔

کتاب و سنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں۔

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہو جائیں اور وہ ان کا امام ہو۔

وہ جو کچھ تعلیم دے۔ ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں

قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں انکی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گونگی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو۔ سب کے دماغ بیکار ہو جائیں، صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے۔ صرف ہاتھ پاؤں جو عمل کریں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے، مگر نہ تو جماعت ہے نہ اُمت" "نہ قوم" "نہ اجتماع" اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکڑے کر دی جا سکتی ہیں مگر زنجیر نہیں ہے۔ جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر سکتی ہے۔

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کی تمام گزشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کر دی حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آ گیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے۔ فقد جاء اشراطھا۔ فانی لھم اذا جاءتھم ذکرٰھم؟

اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا۔ سچے کام کے کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے مگر جب کبھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی۔ معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب بھی کر دیا

جائے سچائی اور نیکی ہے اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سُن پاتے ہو اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اٹھتا ہے۔ یکایک اعتقاد اور عمل دونوں تمہیں یاد آجاتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے ہے۔ تمہاری مصیبت دائمی۔ تمہارا ماتم ہمیشگی کا۔ تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا اور تمہاری نحوست چوبیس گھنٹے تمہاری ساتھی ہے۔ اور ٹھیک اسی کی طرح تمہاری کامیابی وخوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سایہ کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

تم وقت پر سامنے آجانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تک دل وجگر کا علاج نہ ہوگا، سو نئے نئے روگ لگتے رہیں گے۔ خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا ———— پس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی، ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے اور قوم اور فرد، دونوں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے۔ ایمان کی گم گشتگی اور محرومی کا ہے۔

درازیِ شب و بیداریِ من ایں ہمہ نیست
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفت ست

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم

بورنازک معاملہ ہے، اگر آج مسلمانوں میں ان کے ائمہ ومشاہیر موجود ہوتے تو ان میں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا۔ کسی ایک صاحب نظر وعمل کے احکام پر سب کاربند ہو جاتے لیکن اس کے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے۔ ہر قلم امام ومجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی داہنے بلاتا ہے، کوئی بائیں۔ کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، یہ مہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب وسنت کے معارف وغوامض سے معمور ہو وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر ان کے وطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ وصلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرے اور پھر تمام مصالح ومقاصد شرعیہ وملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوی شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اس کا اہل ہے۔ نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پا سکتا ہے۔ اس کو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید!

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں۔ نہ جوش وگرمی کی کمی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ خطر بھی ہو جا سکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اس کی طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک

اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی۔ وہ ٹرین کو منزلِ مقصود پر پہنچاتی ہے مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔

"جذبات" اسی وقت کام دے سکتے ہیں جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم و تقاضا کے لیے "اور اک" اور "دماغ" بھی موجود ہو۔ وذلک من علم النبوۃ ولکن لا یعقلھا الا العالمون

بہر حال اس وقت، اور ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے "راہِ عمل" یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں۔ اسی پر مسئلہ خلافتِ اسلامی کے بھی تمام معاملات و اعمال موقوف ہیں۔

تمام مسلمانوں کو ان ہمدردانِ ملت کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اس کی شاخوں کے قیام کا سر و سامان کیا۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام مسلمانوں کو نظامِ جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی۔ ایجی ٹیشن جاری رکھے گی۔ تبلیغ و اشاعت کرے گی لیکن نہ تو وہ قوم سنبھال سکتی ہے۔ نہ کمیٹیوں سے جماعت پیدا ہو سکتی ہے نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ وہ خود احکامِ شرعیہ کے علم کے لیے، اپنے قیام و تکمیل کے لیے دفعِ تفرقہ و انتشار کے لیے اور روحِ اجتماع و قوام کے نفوذ کے لیے ایک بالاتر قوت حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے۔ اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اس کی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

نظامِ شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا ہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکھے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے؟ اور نہ ہر شخص اور چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالات پر اصول و احکامِ شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک

جزئیہ حوادث وواقعات پر پوری کاروانی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا۔ امت وفرع کے اصولی مقاصد اس کے سامنے ہوں گے۔ کسی ایک گوشہ ہی میں ایسا مستغرق نہ ہو جائے گا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہو جائے۔

حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعمالِ مہمۂ امت کی بین منہاجِ نبوت پر اس کا قدم استوار ہوگا۔ اوران ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت ہر تغیر، ہر حالت، ہر جماعت کے لیے احکامِ شرعیہ کا استنباط کر سکے گا۔

زباں زنطق فرو ماند و رازِ من باقی ست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی ست

عزیزانِ ملت! اس طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی افسانۂ کہن ہے جو پہلے دس سالوں سے برابر دہرا تا رہا ہوں اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہو گئی ہیں، تو تم اس کی تصدیق کرو گے۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی راہیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر پکار رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں ولکن لا تحبون الناصحین۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و انفعالِ ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت

جتنی سستی۔ اتنا ہی انحراف آسان ہے۔ اور اسی نسبت تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو، خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو۔ یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں، مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں، اور یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے۔

تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جعلوا اصابعہم فی اذانہم، واستغشوا ثیابہم، واصروا، واستکبروا استکبارًا کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کر دیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی، فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لیکن فلم یزدھم دعائی الا فرارًا

بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشۂ قید و بند میں چلا گیا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کن کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آگیا ہوں لیکن تمہاری بھیڑوں اور نعروں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود ہوتا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اتارو۔ اور ایسے پرجوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی جھنڈیاں ہوں اور پھر اپنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے۔ مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر

کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفتِ خوشحالان و بد حالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من — وز درونِ من نہ جست اسرارِ من
سرِ من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را گوشِ آں منظور نیست

میری راؤں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی۔ نہ میرے سفر میں کبھی یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے، اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع، لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں۔ الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا۔ وہ میرے عقائد و معلومات تھے۔ بڑوں کی طرح آراء و مظنونات نہ تھے۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا۔ بہتوں نے استہزاء کیا۔ کتنوں نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرت دعووں کا اعلان ہے یرید ان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری، اور ایک طرح کی ادیبانہ افسونگری ہے۔ (اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا) لیکن دیکھو بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ اور بہتوں نے نادانستہ۔ مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب سی مافوق الفطرت دعووں اور ساحرانہ فصاحت طرازیوں کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو اور "قیام شریعت" اور تقدیم و اتباع شریعت اور حفظ و دفاع ملت کے ناموں سے

موسوم کرتے ہو۔

پس جب کہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا۔ راہِ عمل کے لیے تمہارا رُخ وہ ہے جس کی طرف تم مُڑ رہے ہو۔ اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بُلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ کر میرے حکم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔ فستذکرون ما اقول لکم و افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔

شہادت حسینؑ

اجلاسِ عام ——— کلکتہ

دسمبر ۱۹۲۱

اے عزیزانِ من! درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اُس روانیٔ آب تسلسلِ صدا اور ہنگامۂ شور و غوغا ہی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں، ماتموں کے نام سے ظہور میں آجائیں۔ اور اگر اُن کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں، اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہ تعالیٰ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ
مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۙ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۙ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ
صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

شمعہا بردہ ام از صدق بخاکِ شہدا
تادل و دیدۂ خونابہ فشانم دادند

برادرانِ عزیز! آج جس حادثۂ کبریٰ اور شہادتِ عظمےٰ کے تذکار و درس کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں وہ وقائع و حوادثِ اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو تاریخِ اسلام کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب و غریب تاثر ماتم و درد اور عبرت انگیز بقائے ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخِ اسلام بلکہ تمام حوادثِ مجزنۂ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آنسو جمع کیے جائیں جو ۶۱ھ ہجری سے لے کر اس وقت تک اس واقعۂ جانسوز پر بہائے گئے ہیں۔ اگر وہ تمام درد آہ و فغاں سوز اں یکجا کیا جا سکے جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعد و لاتحصیٰ اسلامی نسلوں کی

صدا ہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے اور درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب و الم کی وہ تمام پکاریں، سوزش و تپش کی وہ تمام بیقراریاں، اکٹھی کی جا سکیں، جو اس حادثۂ بکبری کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں؛ تو اے عزیزانِ ماتم شعار! کون کہہ سکتا ہے، کہ خونفشانیہائے حسرت کا ایک نیا اٹلانٹک وا وقیانوس سطحِ ارضی پر بہ نہ جائے گا، وہ آہ و فغاں کی ہزار ہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی اور درد و الم کی چیخوں، حسرت کی صداؤں، تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامۂ خونیں سے تمام عالم ایک شورزار و نالہ نہ بن جائے گا۔

تاہم میں جو پیام پہنچانے کے لیے آج آیا ہوں وہ اس تذکرہ سے بالکل مختلف ہے میں غم و الم کی شدت و کثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں۔ بلکہ اس عدیم النظیر شدت و کثرت کے بعد بھی آنسوؤں کی طلب ہوں، آہوں کی صدا ہوں، بے قراری کی پکار ہوں اضطراب کی دعوت ہوں، اور آہ! آہ! اے صد ہزار آہ و حرمان، کہ غم کے لیے بھوکا ہوں۔ اور درد و الم کے لیے یک قلم پیاس ہوں۔ پس میں آج ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں، مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لیے نم آلود ہیں میں اُن دلوں کی سرگزشت نہیں سناتا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہوں۔ میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے لیے مضطرب ہیں مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجی ہائے ماضی کا ادعا ہے۔ آہ میں تو اُن زبانوں کے لیے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں، اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشاط و نادانی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر دے سکتا ہے؛ جس کو عیش و عشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں۔

نہ داغِ تازہ می خارد، نہ زخمِ کہنہ می کارد
دلے یارب بدہ کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

ہاں یہ سچ ہے۔ کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنے والوں نے

ماتم میں گونج کی۔ آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامۂ الم کی مجلس طرازیاں کیں، اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے، جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثۂ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کر و، کہ باایں ہمہ اس حادثۂ عظیمہ کی دعوتِ اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی دعوتِ درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی وہ اب تک لبیک کے پیچھے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دورانِ محرم و عشرۂ ماتم کے اس پر گزر چکی ہیں۔ لیکن اب تک خاکِ کربلا کے وہ ذرات خون آشام، جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خون شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لیے پکار رہے ہیں۔ خونفشانیوں کے لیے داعی ہیں، آہ و فغاں کے لیے تشنہ ہیں، اضطراب و التہاب کے لیے بے قرار ہیں۔ اور فضائے ریگ زارِ کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک افشاں، جگر ہائے سوختہ، دلہائے دو نیم، اور زبانہائے ماتم سرا کے لیے اسی طرح چشم براہ ہے جس طرح ۶۱ھ ہجری کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامۂ احتضار، اور ظلم و مظلومی، جرح و مجروحی، قتل و مقتولی کے ہنگامۂ الیم کے ماندہ سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوت تھا۔

شدیم خاک ولیکن ببوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

لیکن اگر یہ دعوتِ درد محض اس پانی کے لیے ہے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے اگر یہ طلبِ غم محض ان صداؤں کے لیے ہے۔ جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں دریاؤں کے سیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہو، اگر یہ انتظارِ الم محض اس ماتم کے لیے ہے۔ جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دستِ دبازو کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو، تو اے برادرانِ غفلت شعار! و اے چشمانِ خواب آلودہ! بلاشبہ یہ سب کچھ ہو چکا، اور بلاشبہ سوالی کو جواب، دعوت کو لبیک، اور طلب کو مطلوب مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا اور

رونی کے لیے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے، تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لیے دنیا کو شور و غوغا سے لبریز کر دے سکتے ہیں تو آدم کی اولاد اپنے آہ بکا سے کیوں آسمان کو سر پر نہیں اٹھا سکتے؟ اگر بے جان و بے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر دیتا ہے، تو تم کہ روح اور ارادہ رکھتے ہو اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامۂ زیر دشت گرم نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے اُن زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی ہیں حالانکہ انہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے اُن جسموں کا تماشا نہیں دیکھا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ اُن کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟ پھر کیا اس غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں، مگر دل نہیں ہیں، کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے؟ کیا وہ کان بھی نہیں ہیں جو سامع ہیں، مگر کان نہیں ہیں کیونکہ نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں، کیونکہ نہیں دیکھتیں؟ لَهُمْ قُلُوبٌ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا، وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا - أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ -

پس اے عزیزانِ من اور درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اُس رونا بے تسلسلِ صدا اور ہنگامۂ غوغا ہی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، نغانوں، اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجائیں۔ اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں، اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔ بلکہ یہ دعوت، یہ پکار، یہ طلب، یہ هَلْ مِنْ مُجِيبٍ فی الحقیقت اُن آنسوؤں کے لیے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے بہیں، وہ ان آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لپٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ اعماقِ قلب سے اُٹھیں۔ وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لیے نہیں

پکارتی بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لئے تشنہ ہے۔ اگر تمہارے پاس اس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اُسے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک، بصیرت کی ایک تڑپ، احساسِ صحیح وحق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے؟

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ! سید الشہداء مظلوم کی مظلومی اور بالعجب غفلت و نادانی کی بوقلمونی اس سے بڑھ کر دنیا میں مظلومی کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادتِ عظیمہ کی عظمت منانی چاہی، مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی حقیقت و بصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا جو گو رو ئے مگر اس کی اصلی تقدیس و شرف کے لیے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو دشمن تھے، اس لیے انہوں نے اس کی دعوتِ حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست دوست ہو کر بھی اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے او تراهم ینظرون الیک وهم لا یبصرون۔

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو، اور دعوتِ درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمہاری آنکھیں اس حادثے پر بہت رو چکی ہیں، مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے اور اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رُلاؤ، ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجیے جس میں دل کی اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ انسان کی ساری کائنات، حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔ فانها لا تعمی الابصار، ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

آج ہمارا اجتماع اس لئے ہے کہ اس حادثۂ عظیمہ پر غور و فکر کی ایک نئی صفِ ماتم بچھائیں، اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے، اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے:

فذکر، ان الذکریٰ تنفع المومنین!

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اس واقعہ کی یادگار اور اس کا دائمی تذکار ہے۔ دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے اُن واقعات و حوادث کی ہمیشہ تعظیم کی ہے۔ جن کے اندر قوم و ملک کے لیے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی، اور ہمیشہ اُن انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں، اور قومی مجمعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا ہے۔ جن کے اندر خود اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے۔

یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محب الوطنوں، اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہومر نے ایلیڈ رکھی۔ کالڈیا کے حجری کتب خانے[1] میں وہ اینٹیں رکھی گئیں۔ جن پر نامورانِ ملت کے مناقب و محامد کندہ تھے۔ عرب جاہلیت نے اپنے سلسلۂ انساب کا ایک حرف ضائع نہ ہونے دیا، اور ذوالمجنہ اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر و معالی کی داستاں سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے مینار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولیں کی طرح محکم و استوار ہیں، اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا۔ ہندوستان کے مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا، اور

---

[1] حجری کتب خانہ سے مقصود تمدن بابل و کالڈیا کا وہ عہدِ علمی ہے جبکہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی جگہ پتھر پر کندہ کرا کے لکھی گئیں، اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثارِ عتیقہ میں موجود ہے۔

والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوامِ قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لیے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد زندہ و قائم رکھی جاتی تھی۔ لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار کا اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا، یا کسی نام کو فراموش نہ ہونے دینا ہی نہیں تھا، بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے کسی خاص نام کسی خاص واقعہ، کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی۔ پچھلوں کو اگر محض یاد ہی رکھنا ہے تو اس کے لیے بڑا اور چھوٹا، ادنیٰ و اعلیٰ، نیک و بد سب یکساں ہیں۔ کونسی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور ہنے بال کو یاد رکھا جائے، اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے جو اسی عہد میں گزرا تھا؟ پس وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماعِ انسانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے، دراصل ناموں، وجودوں، شخصیتوں اور محض تذکرہ و یادآوری سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ اعمالِ حسنہ، عزائمِ مہمہ، نتائجِ عظیمہ اور بصائر و مواعظِ جلیلہ اُن مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں، اور جن کی یاد اور تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لیے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوتِ عمل و اتباع ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ حی و قائم رکھا جائے، اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمالِ حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں۔

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی، بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی۔ اور تذکرہ و یادآوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی، بلکہ ان سچائیوں کی تھی جو وہ اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔ خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف اپنی ہی کبریائی کے لیے مخصوص کر لی ہے اور دنیا کو جو کچھ دیا گیا ہے، وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے، وہ فاطر السمٰوٰت والارض ہے۔ البتہ "عمل" بڑا ہو سکتا ہے اور اس کی بڑائی سے اس کے عامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آجاتی

ہے۔ پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیسیں، ہر طرح کا احترام و شرف جو دنیا میں کیا جا سکتا ہے یا تو خدا کے لیے ہے، یا پھر خدا کی سچائی اور اس کے قرار دیئے ہوئے اعمالِ حسنہ کے لیے۔ خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں: الحمد للہ رب العلمین میں "الحمد" کے الف لام کا یہی مطلب ہے جسے میں نے آغازِ تقریر میں تلاوت کیا۔ اور

انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم سے اسی پر روشنی پڑتی ہے۔ اور جو لوگ ان یحمدوا بما لم یفعلوا (یہ بدبخت چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف و ثنا ان اعمال کے لیے کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے۔ حالانکہ "حمد" کا استحقاق تو اعمال ہی کو تھا) اسی کی مزید توضیح کرتا ہے: وما یعقلھا الا العالمون!

لیکن دنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ بسا اوقات اس کی جانب قدم تو اٹھاتی ہے، پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم نے انسان کے نقصان و خسران کے جو مختلف حالات بیان کیے ہیں، ان میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنے والی حالت کے لیے "ضلالت" کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی سورۂ فاتحہ میں، جس کے ماتحت آج کی تقریر ہے، "مغضوب علیھم" کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسم "الضالین" تذکرہ کیا گیا ہے۔ "ضلالت" کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تم کو معلوم ہے کہ "گمراہی" اور "راستے میں بھٹک جانے" کے ہیں۔ اسی لیے متحیر اور غیر معین نظر رکھنے والے پر بھی "ضال" کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ کوئی متعین راہ اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ پس قرآن کریم نے نوعِ انسانی کی بدحالی و تباہی کی سب سے بڑی حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کو اٹھنے اور چلنے سے انکار نہیں ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے

پر ہوتا یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی حقیقی شاہراہ اس پر نہیں کھلتی، اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزلِ مقصود سے اسی طرح محروم رہتا ہے، جس طرح وہ شقی و جاحد محروم رہا جس نے چلنے کا قصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاح قرآنی میں "تحبط اعمال" کی ہے جس پر جا بجا مختلف پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ: فحبطت اعمالھم (ان کی تمام محنتیں، کوششیں، اور راہروی کی مشقت بالکل اکارت گئی، اور اس کا کوئی پھل انہیں نہ ملا)

چنانچہ اس "ضلالت" عمل کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مظاہر پرستی" بھی ہے جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت اہم، عظیم المنفعت، حیات پرور اور سعادت بخش حقیقت تھی۔ لیکن با ایں ہمہ اس بارے میں ہمیشہ قوموں نے غلطی کی اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھائی۔ وہ دنیا کی عالمگیر ضلالتِ کبریٰ جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی اور ظواہر و رسوم کی اس سے پوجا کراتی ہے، افسوس کہ اس حقیقت کے لیے بھی ہلاکت بخش ہوئی اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس طرح اس عملِ عظیم کو آلودہ کر دیا گیا کہ بسا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی۔

ہماں عشق ست بر خونِ چکیدہ چند ایں داستاں ورنہ
کسے بر معنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

انسان کی ایک عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی روح کے لیے اختیار کرتا ہے لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر سلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمالِ حسنہ کی یاد اور نیکی و صداقت کے عملی نمونوں کی پیروی و اتباع کے لیے قائم رکھنا تھا۔ لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی، اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لیے واسطہ و ذریعہ تھی، خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد و اعمال میں جاگزیں ہو گئی، اور

حقیقت سے اس قدر بعد و نسیان ہو گیا کہ محض رسوم و اسمار کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قانع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی بسا اوقات دنیا میں بُت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد و اسمار کی پرستش محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہنچا دیا۔

اے برادرانِ ملت! یہی حقیقتِ اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے "اسوہ حسنہ" کے جامع و مانع لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہی مقام ہے جہاں آ کر اسلام کی قوتِ اصلاح اور ختم نبوت کی اصلی علت آشکار ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا جن کی اختلاط و آلودگی سے ان کی روحِ حقیقت اور تاثیرِ عمل بالکل فنا ہو گئی تھی۔

لایاتیہ الباطل من بین	قرآن ایک ایسا معلم و ہادی ہے
یدیہ ولا من خلفہ تنزیل	کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے،
من حکیم حمید۔	اور نہ اُس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے

وہ خدائے حکیم و مجید کا اتارا ہوا ہے پھر باطل کا یہاں کیا گذر؟

ہاں باطل کیونکر اب اس کے ساتھ مل سکتا ہے جبکہ وہ "حق خالص" ہے اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملا دی گئی تھی، اس سے انسان کے ہر اعتقاد و عمل کو بالکل صاف پاک کر دیا ہے۔ نیز جا بجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ انسان کو اس کے سفرِ اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے، اور اسی طرح "شفاء" کہا۔ کیونکہ وہ مثل مفید و نافع ادویہ کے ہے جو مریض کی اصلی قوتِ طبیعی کو مزید توانائی اور نشوونما دیتی ہیں۔ اور مضر اثرات و مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں ان کو دور کر دیتی ہیں۔

"اسوہ" کہتے ہیں کسی فکر، کسی عمل، کسی وصف، کسی خاصہ کے ایک ایسے نمونے کو جسے تم اس لیے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے۔ اور اس کی سی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہو گے۔ انسانی سعادت کے لیے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک

کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں، جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رُلا دے سکتی ہیں مگر اس کے دلوں کو نہیں پھیر دے سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے سکتا ہے۔ لیکن اس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بُروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا دے سکتے ہیں لیکن بُرے انسانوں کو نیک نہیں بنا سکتے

بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک اور مزکی انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو، اور اس کے اعمالِ حیات راست بازی کے لیے "اسوہ" کا حکم رکھتے ہوں تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص، بلکہ اقوام و امم کے اعمال کو یکسر پلٹ دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لیے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا، بلکہ اس کے ساتھ انبیائے کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حامل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا۔ وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے، اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک و مطہر زندگی تھی۔ اگر شریعت بصورتِ قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی، تو بصورتِ وجودِ حی و قائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ اگر اس کی آیات بینات حروف و اصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں، تو انبیائے کرام کی زندگیِ عمل فعل کے ذریعے اس کی تصویر دکھلا دیتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہیے تو حیاتِ نبوت ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت بیان کیا تھا جب کہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال کا حال پوچھا گیا تھا۔ "کہ کان خلقہ القرآن" اگر تم ان کے خلقِ عظیم کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن کو دیکھ لو، یہاں حروف و الفاظ ہیں،

وہاں ایک پیکرِ مجسم تھا۔ یہاں قوت ہے، وہاں فعل تھا۔ یہاں چراغ ہے اور وہاں اس کی روشنی تھی حقیقت ایک ہی ہے جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ "سنت" کتاب کا ایک حقیقی جزو، اور مفہوم "کتاب" میں تبعاً داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر بیں اس حقیقت سے بے خبر ہیں، وہ قرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "حدیث" کی پیروی کا اثبات کرتا ہے۔ حالانکہ "سنت" کی اطاعت کتاب کی اطاعت میں داخل ہے، اور "سنت" علم قرآنی ہی کی عملی تفسیر ہے۔

اور اگر یہ سچ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے خوارج و منکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ "میں قرآنِ ناطق ہوں" تو میں اس کی تصدیق کے لیے تیار ہوں اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ یہ بہت ہی بڑا دعویٰ تھا۔ یقیناً یہ بڑے سے بڑا دعویٰ تھا جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ لیکن اگر حضرت امیرؑ نے کیا تھا تو غلط نہ تھا۔ اگر ان کی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوۂ حسنہ" کا ایک کامل عکس تھا، اور ان کے اعمال کی روشنی سراجِ منیرِ رسالت ہی سے ماخوذ تھی، تو کیوں انہیں یہ حق نہ تھا کہ وہ اپنے تئیں "قرآنِ ناطق" کہیں!

جو کتابِ الٰہی مابین الدفتین حروف و نقوش کی شکل میں تھی، اس کی ہستی ناطق تھی جو اعمال حضرت مرتضویٰ کے اندر سے پکارتی تھی۔ کہ یہ علی بن ابی طالب کی آواز ہے، لیکن ابوذر اور سلمان کی حقیقت شناسی جانتی تھی کہ یہ علی ابن ابی طالب کی آواز نہیں بلکہ القرآن الحکیم کی صدائے الٰہی ہے، اور چونکہ "القرآن" کی آواز ہے، اس لیے یقیناً خود منزل القرآن کی آواز ہے:۔ کنت سمعہ الذی یسمع بہ، ولسانہ الذی یتکلم بہ (بخاری)

بہر حال یہ مبحث بجائے خود محتاجِ تفصیل و نظر ہے۔ مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت

انسانی کے لیے "تعلیم" کے ساتھ "نمونہ" اور "کتاب" کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے اسی لیے قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیمات کے لیے اس چیز کو ایک اساسی حقیقت قرار دیا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔	بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور ہدایت آیا اور کتاب الٰہی کی تعلیم بالکل واضح و روشن ہے۔

اس آیہ کریمہ میں نور سے مراد حامل قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود اقدس ہے، اور "کتاب مبین" قرآن ہے، یہ "نور" ہی "اسوہ حسنہ" ہے جو حامل قرآن کی مقدس زندگی میں علم قرآنی کا وجود "عملی" تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	بلاشبہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی پیروی و اتباع کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

عربی میں "اسوہ" کا لفظ ہر نمونے کے لیے کہا جاتا ہے، اور نمونہ جس طرح خیر کا ہو سکتا ہے اسی طرح شر کا بھی ہو سکتا ہے، اس لیے قرآنِ حکیم نے "حسنہ" کے لفظ سے اسے متصف کیا، تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل و محاسن کا نمونہ مقصود ہے، اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورۃ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملتِ حنیفی و فطری کے اولین موسس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی لفظ آیا ہے۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ،

دنیا میں اعمالِ مقدسہ و حسنہ کی یادگار قائم کرنے کا مقصد بھی یہی "اسوہ حسنہ" تھا یعنی جن لوگوں نے کسی پاک و اعلیٰ عمل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھا جائے، تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے اور اس کا نمونہ انسانوں کو عزائم امور کی طرف دعوت دے

اب دیکھو کہ قرآنِ حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسم کی اصلی حقیقت سے لی

اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اس سے بالکل الگ کردیا۔ اس نے یادگاروں کے لیے پتھر کے بُت نہیں بنائے جن کو حوادثِ ارضی کا ایک طمانچہ گرا دے سکتا ہے، اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لیے ایک سخت داغ تھا۔ اس نے اینٹ اور چونے کی عمارتیں نہیں بنائیں جو طوفان و برق کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لاسکتیں، اور جن کا اثر ظواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے سالانہ مجمعوں اور قومی تقریبوں پر زور نہیں دیا کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ ظواہر و رسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور یادگار کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔ غرض کہ اس نے ان تمام وسائلِ تذکار سے یک قلم انکار کردیا جو عام طور پر تمام قوموں میں رائج تھے، اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کی جاسکتی تھی، پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لیے ان کے اندر کچھ نہ تھا۔ اور اس لیے ہمیشہ اُن کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر ثابت ہوا تھا۔

اے عزیزانِ من! اب میں تمام تمہیدوں اور مقدمات کی مبادیات سے گزر کر اصل موضوع کے قریب آگیا ہوں، اور مجھے زیادہ تیز قدمی کرنی چاہیے۔ مجھے یاد کرنا چاہیے کہ میں نے اپنی تقریر کو سورۃ مبارکہ "فاتحہ" کی تلاوت سے شروع کیا تھا۔ جسے بظاہر آج کی صحبت سے کوئی ربط نہ تھا، مگر وہ "السبع المثانی" ہے، وہ تمام "الکتاب" کا متن ہے، اور وہ اس کی تمام تفصیلات کا وجودِ اجمالی ہے۔ پھر ہدایتِ انسانی کا کونسا مقام ہے جو قرآن کے سلطانِ احاطہ سے باہر رہ گیا ہو؟

غرض کہ قرآنِ حکیم نے یادگار و تذکار کے ان رسمی و ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کردیا جو عام طور پر دنیا نے اختیار کرلیے تھے۔ لیکن جب کہ اس نے وہ سب کچھ نہ کیا جو سب کوئی کرتے آئے تھے، تو سوال یہ ہے کہ خود اُس نے کیا کیا؟

اس نے "اسوۂ حسنہ" کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیمات کا جزوِ اعظم بنایا اور اس کی یادگاروں کو انسان سے باہر نہیں جن کو انسان چھوڑ دے سکتا ہے، بلکہ خود انسان کے اندر

قائم کردیا جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس نے مادی و جسمانی اعمال و اشکال کے اندر اس کی دعوتِ عمل و سعادت کو گم نہیں کر دیا، جیسا کہ گم کر دی گئی تھی، بلکہ اس کو ایک خالص معنوی و روحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کر دیا کہ اس کی حقیقت دائمی طور پر زندہ ہو گئی، اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش سے بالکل محفوظ و مصئون بنا دی گئی!

اس نے سب سے پہلے ہمیں ایک مقدس "دعا" بتلائی، اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی و نیاز کے لیے حاضر ہو، تو سب سے پہلے یہی دعا کو پڑھو یہ وہ وقت ہوگا جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو گے اور اس کی رحمت کا دروازہ باز ہوگا۔ پس ایک عاجز و درماندہ انسان فاطر السموات والارض کے حضور جا کر اپنے لیے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو مانگ سکتا ہے، وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے اور چاہیے کہ تم اسی نعمت کے سائل، اسی مطلوب کے طالب، اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

یہ دعا سورۂ فاتحہ ہے جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے، اور وہ نعمت، وہ دولت، وہ متاعِ مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے جس کے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے:-

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ — خدایا! تو ہمیں الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق دے!

یہ "الصراط المستقیم" کونسی راہ ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ البتہ یہ بتلایا گیا ہے کہ:-

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ — ان لوگوں کی راہ جن پر اے پروردگار تو نے انعام کیا۔

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوئی جو "انعام یافتہ" لوگوں کی راہ ہے،

یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں، انہیں کی راہ عَلَی الصراط المستقیم ہوگی چنانچہ سورۂ نسار میں "انعام یافتہ" جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے "أنعمت علیهم" میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جن لوگوں نے اللہ اور رسول
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ	کی اطاعت کی، تو وہ سب ان خوش
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ	نصیبوں کے ساتھی ہو جائیں گے جن پر
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ	اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ اور جن پر اللہ
اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔	تعالیٰ نے انعام کیا ہے، وہ انبیاء ہیں

صدیقین ہیں، شہدا ہیں، اور صالحین ہیں جس کسی کو ایسی انعام یافتہ جماعتوں کی معیت ملے، تو کیا اچھی ہے اس کی معیت، اور کیا اچھے ہیں اس کے رفیق۔

اس آیۂ کریمہ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس "الصراط المستقیم" کے تعین کے لیے صرف اس قدر اشارہ کیا تھا کہ وہ انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے وہ کون لوگ ہیں؛ نیز ان کے مختلف مدارج و مقامات کیا کیا ہیں؛ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا ہے اور انہیں "انعام یافتہ" کہا ہے، انہی کی راہِ حق، وہ راہِ ہدایت و سعادت ہوگی جس کا نام لسان الٰہی نے "الصراط المستقیم" رکھا ہے، اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیہم اور الضالین" کی صراط مغضوبیت و ضلالت سے الگ نہیں ہو سکتی۔

سورۂ نسار کی اس آیۂ کریمہ سے "أنعمت علیهم" کی مزید تفسیر و تشریح کرنا۔ ایک ایسی مسلم اور متفق علیہ تفسیر ہے جسے عہدِ صحابہ و اہلِ بیت نبوۃ (رضوان اللہ علیہم) سے لے کر طبقات متاخرہ تک، تقریباً تمام ارباب علم و رسوخ نے اختیار کیا ہے، اور مفسرین "خاصہ" و "عامہ" سب نے اسے قبول کیا ہے؛ چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کیے ہیں، اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسی (صاحب تفسیر مجمع البیان)

بھی اِس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر "البیان" میں تصریحات حضرت ائمہ کرام علیہم السلام و اقوالِ مفسرین خاصہ بھی نقل کر دیے ہیں۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ

بہر حال یہ آیۂ کریمہ بتلاتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورۂ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے وہ راہ "انعام یافتہ" گروہ کی ہے۔ انعام یافتہ گروہ چار ہیں۔ "الانبیاء الصدیقین الشہداء الصالحون"۔

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے اصلی مقصد کو تمام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کر کے کس طرح قائم کر دیا ہے اور اس کے لیے کیسی دائم و قائم اور محفوظ و مصئون راہ اختیار کی ہے۔ اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں زمین پر قائم نہیں کیں لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش کر دیا۔ اس نے ہر مومن بالغ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی، اور حکم دیا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ سورہ فاتحہ کیا ہے؟ تحمید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے جو انسان اپنے خداوند کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ "الصراط المستقیم" پر چلنے کی التجا ہے تاکہ اس راہ کی اسے توفیق ملے، اور سعادتِ کونین حاصل ہو۔

اب اور آگے بڑھو اور دیکھو کہ "الصراط المستقیم" کونسی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار ہر مومن یاد کرتا اور اپنے خدا کے حضور جا کر مانگتا ہے۔ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریقِ حصول یا اس کے عقائد و اعمال نہیں بتلائے گئے بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلا دی گئی جنہوں نے ایسے عقائد، ایسے اعمال، ایسے عزائم، ایسے اقدام کیے تھے جن کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرے تھے۔ یہی چیز "یادگار" ہے یہی "تذکار" ہے یہی وہ "مشاہیر پرستی" کی حقیقت اصلی ہے جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈا مگر نہ پایا وہ کبھی پتھر کے بتوں، کبھی اینٹوں کی عمارتوں، کبھی انسان کے مجسموں، کبھی ملکوں اور قوموں کی وقتی رسموں اور تقریبوں میں بھٹک کر رہ گئی، اور "صراط الذین انعم اللہ علیہم" کی جگہ "الضالین" کی صراط پر چل گئی۔

عزیزانِ من! مشاہیر پرستی کے زوائد و اباطیل کو چھوڑ دو، صرف اس کی اصلی حقیقت کو سامنے لاؤ۔ وہ کیا ہے؟ کیا صرف یہی نہیں ہے کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں اور نیکی و صداقت کی راہ پر چلے ہیں اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی یاد ان کے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کرے۔ اور اس یاد آوری و تازگی سے قوموں کے لیے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؟ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کارفرما ہے۔ سورۂ فاتحہ نے انسان کی راہ سعادت و ترقی کے لیے نہ تو عقائد و افکار بیان کیے، اور نہ اعمال و افعال، بلکہ انسانوں کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتۂ الٰہی تھے۔ یعنی جو انسان راہِ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اُسے چاہیے کہ انعام یافتہ انسانوں کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقائد و اعمال کے نمونے کو کبھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عملی ہستیوں کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار ہے، مگر ایسا تذکار جو اپنے خصائص کے لحاظ سے تمام تذکار کے لیے اعلیٰ مرتبہ رکھتا ہے!

پھر ان انعام یافتہ لوگوں کی تشریح کی کہ وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں صالحین ہیں۔ پھر ان میں سے ہر گروہ کے وہ اعمالِ حسنہ جو قرآنِ حکیم میں مشرح بیان کیے جن سے "الصراط المستقیم" کی راہِ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی اصلی غرض یہی "انعمت علیہم" کی تفسیر سمجھو۔ یہ چار گروہ وہ ہیں جن کے اندر نوعِ انسانی کا تمام صالح و اسعد حصہ آگیا، اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر ہوگی، تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی جماعت سے متعلق ہو۔ پس غور کرو کہ تم یادگار، یادگار پکار رہے ہو، تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لیے بے قرار ہے۔ کرۂ ارضی کی ہر متمدن انسانی جماعت انسانی بڑھیوں کا تذکرہ کرنا چاہتی ہے لیکن یہ کسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے جو اس کی تمام خرابیوں کو دور کر کے قرآنِ حکیم نے عطا کی ہے۔ دنیا کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو

تذکار کا منشا بھی ہے اور زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے لیکن قرآنِ حکیم نے کرۂ ارضی کی تمام حقیقی برائیوں اور اعمالِ صالحہ کے تمام گھرانوں کو چن لیا، اور حکم دیا کہ تم ان سب کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھو اور سب کے بڑے بڑے کاموں، بڑے بڑے عزموں، بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہِ ایمان و اسلام کو مرکب و متقوم بناؤ۔ تم یاد گاریں منا کر سال میں ایک مرتبہ انہیں یاد کر سکتے ہو اور رسماتی و سنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال لے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے لیکن دیکھو، تمہارے قرآن نے کیسی یادگار قائم کی جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے اور صرف ایک ہی بڑے انسان کو نہیں بلکہ تمام راست باز انسانوں کو جو انبیائے صدیقین، شہدا اور صالحین میں گزرے، وہ یاد کرتا اور اُن کے اعمالِ مقدسہ کے نمونوں پر چل کر راہِ سعادت کی مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔

حادثہ محزنہ کربلا: حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا اور اشک بار آنکھوں سے پڑھا گیا ہے۔ لیکن اس دردانگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعتِ اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوہ ہائے حسنہ مخفی تھے جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہا لے گئے۔

اس لیے اب ہم کو قدیم زمانہ کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقہ ماتم کا اضافہ کرنا چاہیے اور خون آلود آنسوؤں کا جو چشمہ ہمارے زخم رسیدہ دلوں سے ابل رہا تھا، اس کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے خود واقعۂ شہادت کو اسرارِ شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریقہ ہو گیا اور شریعت نے امت محمدیہ کو اسی قسم کے طریقِ ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

دنیا میں اسلاف پرستی کا فطری مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اسی بنا

پر تمام قوموں نے اپنے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے منایا ہے، اور ان کے اعمال کو آئندہ نسل کی عبرت و بصیرت کے لیے زندہ رکھنا چاہا ہے۔ لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا، وہ وہی ہے جس کی بنیاد دنیا کی بُت پرستی نے رکھی۔ اور در اصل اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اس کو سمجھنا چاہیے۔ پہلی اس لیے کہ بسا اوقات انسانوں نے اسی راہ سے اصنام پرستی کی منزل پائی اور آخری اس لیے کہ بت پرستی خود تو چلی گئی مگر اپنا نقشِ قدم اس شکل میں اب تک چھوڑ گئی ہے۔

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقہ کی طرف ہے جس کی بنا پر مشاہیر ملک و قوم کے مجسمے (اسٹیچو ر) بنائے جاتے ہیں اور ان کو اس لیے نصب کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ مشاہیر کی یاد دلائی جائے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی جائے ؛

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اس قسم کے متعدد مجسمے قائم ہو چکے تھے اور اُن کی علانیہ پرستش کی جاتی تھی لیکن یونان و مصر نے ان مجسموں پر تمدن و تہذیب کا آب و رنگ چڑھا کر ان کو اور بھی شاندار و دلفریب بنا دیا۔ آج یورپ بانیانِ تہذیب و تمدن کے دیوتاؤں کی جو نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے ان کے اندر یونان کی اُس قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو صفیں نظر آ رہی ہیں، ان میں بھی اسی کی جھلک پائی جاتی ہے ؛

لیکن اسلام ایک دینِ خالص تھا جو توحیدِ خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا اور انسانی عظمت کی ان تمام راہوں کا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو کسی حال میں بھی الٰہی عظمت کے نقطہ تک پہنچ سکتی تھیں یا قریب ہو سکتی تھیں۔ پس وہ کسی طرح بھی قیامِ ذکر و بقائے عظمت کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا جس میں پڑ کر دنیا بار بار

شوار کھا چکی تھی ؛

اسلام نے ظاہر ہوتے ہی دنیا کے تمام اعمال و معمولات پر نظر ڈالی، اور ہر عمل کی حقیقت و روح کو لے لیا اور غیر مناسب و ناموزوں جسم و لباس کو چھوڑ دیا ؛

وحشت نے جن حقیقتوں کو تاریک پردوں میں چھپا دیا تھا وہ دفعتاً چاک چاک ہو گئے جہالت نے جن موتیوں کو پتھروں کے ڈھیر میں گم کر دیا تھا وہ ان سے الگ ہو کر دنیا کے دامن مراد میں آ گئے۔ غیر معتدل تمدن نے جن کھلی ہوئی بصیرتوں کو خوشنما چادروں کے آب و رنگ میں راز سربستہ کی طرح مقفل کر دیا تھا۔ وہ یکسر فاش ہو گئے اور حقیقت آفتاب کی طرح علانیہ بے نقاب ہو کر ہر انسان کو نظر آ گئی۔ قرآن حکیم نے اسی انقلاب کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے ؛

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	خدا مسلمانوں کا دوست اور ساتھی
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى	ہے اور وہ ان کو ہر طرح کی انسانی تاریکیوں سے
النُّوْرِ ۥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ	نکال کر فطرت صالحہ کی نورانی روشنی میں لاتا
الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ	ہے اگر کفار کے دوست ان کے طاغوت
النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ	ہیں جو ان کو خدا کی بخشی ہوئی روشنی سے

نکال کر جہل و ضلالت کی اندھیری کی طرف لے جاتے ہیں ؛

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس کی جھلک اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے اور مشاہیر پر ماتم کرنے کا طریقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ قدما کی یادگار قائم کرنے اور ان کے اعمال و آثار زندہ رکھنے کا جو طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا، اسلام نے اس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔ اس لیے مسلمانوں کو مجسموں کی شکل میں اسلاف پرستی کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ بت پرستی تک منجر ہوتی ہے اور اسلام زندہ انسانوں کے شرف کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا، مگر اس نے مشاہیر کرام اور اسلاف صالحین کے نمونوں کے

فوائدِ عظیمہ کو بھی ضائع ہونے نہ دیا اور اُن کے اثر کو اس طرح حی و قائم کر دیا کہ ہر مومن کے آگے ان کے عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیے، اور کہا کہ دن میں پانچ بار سب خدا کے حضور آؤ تو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگو، ساتھ ہی تشریح بھی کر دی کہ صراطِ مستقیم انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہِ علم و عمل ہے اور اس لیے ان کے نمونے ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں۔ (یہ نہایت اہم مقام ہے۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ فاتحہ میں دیکھنی چاہیے جو بسلسلہ مجلدات البیان فی مقاصد القرآن چھپ رہی ہے)

پس ماتم کی رسم پرستش نے جن تاریک پردوں کو ڈال کر اصل حقیقت کو چھپا دیا تھا اور تمدن تہذیب نے ان پردوں پر نظر فریب رنگ چڑھا کر جن بعیہ تعل کو کم کر دیا تھا، اسلام نے ان سب کو چاک چاک کر دیا، اور مغزِ حقیقت جن چھلکوں میں چھپا ہوا تھا ان سے نکل کر علانیہ آشکارا ہو گیا۔

قرآنِ حکیم میں انبیائے سابقین کے جو قصص مذکور ہیں اُن کے اندر درحقیقت انہی بصائر و حکم کی روح مضمر ہے جو مجسموں کے قالب میں حلول کر کے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب ہو جاتی تھی۔ قرآنِ مجید قدماء و اعاظم رجال کی یادگاروں کے قائم کرنے کے اصل مقصد کو "اسوۂ حسنہ" کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور مسلمانوں کو جا بجا اس پر توجہ دلاتا ہے چنانچہ بار بار انہیں صفحات پر پڑھ چکے ہو کہ اس نے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے نمونہ حیات کو مسلمانوں کا قبلہ وجود و کعبہ انظار قرار دیا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔	تمہارے لیے حضرت ابراہیم کی حیاتِ طیبہ میں اور ان کی زندگی میں جو ان کے ساتھی ہیں پیروی کے لیے بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔

اس بنا پر اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اسلاف پرستی کی صحیح اصول پر اسلامی تعلیم دیتا

ہے، اور اسی صحیح اصول کے مطابق چاہیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کے اندر عزم واستقلال، صبر و ثبات، استبداد شکنی، قیام جمہوریت، امر بالمعروف، و نہی من المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود ہیں، ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں، اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں ساری و جاری کر دیں ؛

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات میں ایک اور عظیم الشان بصیرت بھی موجود ہے، جس کا سلسلہ مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے ؛

دنیا کی مذہبی تاریخ کی ابتدا عجیب بے کسی کی حالت میں ہوئی۔ ہم نے دنیا کے سخت سے سخت معرکوں میں باپ کو بیٹے کا شریک، بھائی کو بھائی کا حامی، بی بی کو شوہر کا مددگار پایا ہے، لیکن صرف مذہب ہی کا روحانی عالم ایک ایسا عالم ہے، جہاں باپ کو بیٹے نے، بھائی کو بھائی نے، شوہر کو بی بی نے چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان کی مصیبتوں میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خاندانِ نبوت ہمیشہ اعزہ و اقارب کی اعانت سے محروم رہا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک شب و روز اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی اور قوم نے بغض و عناد سے ان کے دعوتِ حق کو رد کر دیا اس نے علیحدگی اختیار کر لی اور کانوں میں انگلیاں تک دے لیں ؛

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ	نوح نے عرض کیا خداوندا میں نے شب
قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ	و روز دعوتِ حق کی لیکن اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ وہ
دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا وَاِنِّیْ كُلَّمَا	مجھ سے اور زیادہ بھاگنے لگے میں نے جب جب
دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا	ان کو تیری مغفرت کے لیے پکارا، انھوں نے
اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ	کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اپنے کپڑوں میں
اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا	لپٹ گئے کہ ان تک تیری آواز نہ پہنچ جائے، اڑ گئے

وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۔ حق ناشناس قوم ہمیشہ سخت ہٹ دھرمی اور باطل پرستانہ گھمنڈ کا اظہار کرتی رہی!

لیکن اس پیغمبرانہ آواز کی صدائے بازگشت صرف ان کی قوم ہی کے در و دیوار سے ٹکرا کر ناکامیاب واپس نہیں آئی، بلکہ خود ان کے گھر کے در و دیوار نے بھی اس کو ٹھوکر لگائی اور خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ یعنی اُن کے بیٹے نے بھی اس نور کو قبول نہ کیا۔ آخری وقت میں حضرت نوح علیہ السلام نے پھر اپنے بیٹے کو خدا کی پناہ میں بلایا، لیکن اس وقت بھی اس کا گوش نصیحت نیوش وا نہ ہوا۔ اس لیے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی کی طوفان خیز موجوں میں بہ گیا!

وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ۔ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو جو اپنے شامتِ اعمال کی وجہ سے ان سے علیحدہ تھا پکار کر اے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کا ساتھ نہ دے۔ اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور وہ مجھے اس طوفان سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا تو کس خیالاتِ خام میں مبتلا ہے آج خدا کے عذاب سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا چنانچہ نوح کی پکار کچھ بھی سود مند نہ ہوئی اور اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی اور تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگرچہ ان کا ساتھ دیا لیکن خود اُن کی بی بی ان سے علیحدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی میں شامل ہو گئی!

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ إِلَّا آلَ لُوطٍ ۔ فرشتگانِ عذاب نے کہا: ہم اس گنہگار قوم کو اس کے اعمالِ بد کا نتیجہ

لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَا اِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِيْنَ۔

دکھلانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ ہمارے عذاب سے صرف لوط کا خاندان محفوظ رہے گا اور اُن میں سے بھی ان کی بی بی تمام قوم کے ساتھ عذاب الہٰی میں شامل کرلی جائے گی۔ کیونکہ وہ بھی کافرہ ہے؛

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے خاندانِ نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ان سے علیحدہ ہو گیا تھا، حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ لیکن اس دورِ براہیمی میں بیٹے نے باپ کی، بی بی نے شوہر کی، بھائی نے بھائی کی دعوتِ حق پر لبیک کی صدا بلند کی، اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر پیش آئیں، ان میں برابر کے شریک رہے۔ سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہادِ روحانی کی طرف قدم بڑھایا اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو ایک وادیٔ "غیر ذی زرع" میں ڈال دیا جہاں کئی سو میل تک آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی جس کے لیے خداوند تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا تو انہوں نے باپ کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا؛

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰىؕ قَالَ يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنَاهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ

جب اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا تمہیں راہِ حق میں ذبح کررہا ہوں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ماجرا ہے تم بھی اس پر غور کرو کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بیٹے نے بلا تامل کہا اے میرے باپ! اس

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ۔

خواب سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک اشارہ ہے پس حکم الٰہی کو پورا کیجیے۔ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں اور ثابت قدموں میں پایئے گا جب باپ بیٹے دونوں خدا کے آگے جھک گئے اور باپ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو زمین پر پچھاڑا تو اس وقت ہم نے آواز دی۔ اے ابراہیم بس کرو تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا ہم صاحبانِ احسان کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک بہت ہی بڑی قربانی تھی جس کی تعمیل کیلیے تم تیار ہو گئے تھے۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے خاندان کی اعانت ور فاقت شریک رہی۔ چنانچہ جب ان کو شعلۂ طور کی زبان سے بشارتِ نبوت دی تو ان کی بی بی ان کے ساتھ تھیں۔ بلکہ ان کے لیے وہ آتش کدۂ طور سے آگ لینے گئے تھے۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۔

جب موسٰی مدین سے اپنی بی بی کو لے کر چلے ان کو کوہِ طور کے دامن میں آگ کی روشنی نظر آئی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا یہاں ٹھہرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے، اس کا پتہ لگاتا ہوں شاید تمہارے تاپنے کے لیے آگ حاصل کر سکوں۔

لیکن وادیِ ایمن میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک برقِ خاطف تھی جو فرعون کے خرمنِ ظلم و استبداد پر گرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور یدِ بیضا کی صورت میں ان کو یہ صاعقۂ ہلاکت دیا اور انہوں نے اپنے بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا، تو خدا نے اس کو پورا کیا

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ

خدا نے کہا میں تیرے دست و بازو

وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا ۔ کو تیرے بھائی کی اعانت سے قوی کردوں گا اور تم دونوں کو فرعون پر غالب کردوں گا ۔

چنانچہ حضرت ہارون نے آغازِ کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا اور دعوتِ موسوی کے ہمیشہ شریک دامن رہے ۔

حضرت موسیٰ کے بعد اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی ۔ پہلے خدا کے ایک صالح بندے نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربانی کرنا چاہا تھا ۔ لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی کے جامِ مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے لیے سولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا اس کی طرف بلا کسی باک کے بڑھے ۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ ۔ اور لوگوں نے نہ تو عیسیٰ علیہ السلام
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۔ کو قتل کیا نہ پھانسی دی بلکہ ان پر اس قربانی کی حقیقت مشتبہ ہو گئی ۔

لیکن اسلام کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوئی تھیں ، وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں ۔ یعنی انبیاء نے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنی اولاد کو یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا ۔ جہاد کی یہ ابتدا تھی ، مگر اس کی تکمیل شریعتِ اسلام پر موقوف تھی ۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح عقائد و عبادات اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی ۔ اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا ۔ اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا ۔ شخصی طور پر بھی جو قربانیاں کی گئیں ، وہ راہ ہی میں روک لی گئیں ۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لختِ جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا لیکن اس کا موقعہ ہی نہ آیا ۔ حضرت عیسیٰ سولی کی طرف بڑھے لیکن بچائے گئے ۔ آج تک تمام خاندانِ نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلۂ انبیاء میں نہیں نظر آتی تھی کہ صرف بھائی ، صرف بیٹا ، صرف بیوی ، ہی نے مقصدِ نبوت میں ساتھ نہ دیا ہو بلکہ بلا تمیز خاندانِ نبوت کے اکثر اعضاء و ارکان راہِ حق میں قربان ہوئے ہوں !

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لیے جو ہاتھ بڑھے تھے وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ اور مذہب کی قربانیاں صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ اس لیے جب اُسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آگیا تو خاندانِ نبوت کے زن و مرد، بال بچے غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ ہی سے نہیں بلکہ اسلام کی اصلی حقیقت سے ہے: یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا۔ اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر پہنچ کر گم ہو گئی تھی، اس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندانِ نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لیے ہمیشہ اُجڑتا رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھر بار چھوڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آوارہ گردی کی، اور نبوتِ محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے خاندانِ نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے انہوں نے ایک وادیِ غیر ذی زرع میں شدتِ تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السلام نے بھی میدانِ کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا اور غالباً یہی مقصود ہے ان مفسرینِ امامیہ کا جو "وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ" کی تفسیر میں ذبحِ عظیم شہادتِ امام حسین علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں بعض ائمہ اہل بیت کرام علیہ السلام کے آثار نقل کرتے ہیں۔

اجلاسِ خصوصی انڈین نیشنل کانگریس —— دہلی

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء

ہم ایک ایسے عہدِ انقلاب سے گزر رہے ہیں جو ٹھیک ٹھیک ان
دفتروں کے مانند ہے جن کے مورخین عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے
انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں ـــــ کتنی ہی بستیاں ہیں جو اٹھ اٹھ کر بلند
ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی
تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی
ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل قریب کے دامن میں کیا ہے ـــــ
ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین
یاد کر لیں جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں لیکن بسا اوقات
جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا
ہے،

نمائندگانِ قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں جیسا کہ آج درپیش ہے آپ حالات کے تقاضے سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوانِ قومی میں جمع ہوں اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں یہ وقت، کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی بھی نظیر موجود نہیں تو میں سمجھتا ہوں یہ ایسی بات ہوگی جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوتے تھے تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا۔ لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایام کی جھلک پائی جاتی ہے جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اس دن آپ جنگ کے آغاز سے فکرمند تھے۔ آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی آج گمراہی کا خطرہ پیش آگیا ہے اس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے مضطرب تھے۔ لیکن آج زندہ جاوید حافظ کے لفظوں میں کشتی ایک کنارہ سے چل چکی ہے۔ مگر دوسرا کنارہ ابھی دور ہے اور موجیں گھیر ڈال رہی ہیں۔ حضرات! جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظر

انتخاب مجھ پر پڑی تو مجھے آپ کی جانب سے عزت و اعتماد کا ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسن ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کر سکا ہوں تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ یہ میرے وطن و قوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت ہی بڑی سند ہے۔ میں اس عزت کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں مگر اس ذمہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدس امانت ہے آپ ہی سے ہمرہی و اعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلاشبہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے۔ اور گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوشش حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا کی زمین میں اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کام ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ ایسا ہو پس یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو۔ ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکر مند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ رہے لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہیے ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دستگیری کرے گی اور بالآخر انجام کی فتحمندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

حضرات! میں آج اپنے بحث و نظر کے محدود دائرے سے بے خبر نہیں ہوں خیالات کا ہجوم اور مطالب کی وسعت کتنی ہی میرے لیے ضبط آزما ہو لیکن میں ان حدود کی طرف بڑھنے سے اپنی نگہبانی کروں گا جو آپ کے سالانہ اجلاس کے صدر کے لیے محفوظ رہنا چاہئیں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ اس کی صدارت کے لیے ایک نہایت بہتر انتخاب کر چکے ہیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ ایک انقلابی دور ہے اور منجملہ انقلابات کے ایک انقلاب اس خیال میں بھی ہو چکا ہے جو کبھی اس ایوان کی ادبی رعیات میں بمنزلہ

رسم و قاعدہ کے تھا۔ اب آپ صدرِ مجلس سے متمنی نہیں ہیں کہ وہ آپ کے سیاسی لٹریچر میں کوئی ضخیم اضافہ کرے یا اپنی تھکا دینے والی فصاحت سے آپ کے حوصلہ و سماع کا امتحان لے، بر خلاف اس کے آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد آپ کہہ دے کہ کام شروع کیجیے۔ آپ کے جذبات کا یہ تغیر فی الحقیقت اس بنیادی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کا ابتدائی دَور طے کر کے عمل کی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے اور اس لیے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہے اور اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی ہے :-

پس اگر آج میں اس اجلاس کے اصلی مقصد کے سوا اور تمام ضمنی اور نواحی افکار سے چشم پوشی کر لوں اور جو کچھ عرض کروں اس میں سادگی اور اختصار ملحوظ رکھوں تو میں امید کرتا ہوں یہ ایسی بات ہو گی جس میں اپنی خواہش سے زیادہ آپ کی خواہش کی تعمیل کروں گا :-

لیکن اگر میں وقت کے حالات و مسائل پر نظر بھی ڈالتا جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کون سی بات ہے جو نئی ہو سکتی ہے؛ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات یا محسوسات کے لیے کوئی نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے؛ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر نکتہ چینی شکایت میں مبدل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی صورت اختیار کر لی۔ ایک مدت تک ہمارا طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی۔ لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو گئے ہیں گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ اپنے علم و یقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجۂ یقین تک آ چکی ہے اس میں نہ تو مزید اضافہ

ہو سکتا ہے نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ برابر ہوتا رہے گا جب تک ہم اسے خود بدل نہ دیں گے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے جن کی تبدیلی حالات پر موثر ہو ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نامنصفانہ ہے اور اگر اس وقت تک قائم رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچا دیے ہیں۔ پس جب کہ ناانصافی اس کا عمل نہیں ہے بلکہ خاصہ ہے تو ہمیں نہ تو متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے ؀

البتہ میں حقیقتِ کہنہ کے اُن تازہ اعترافات کا پوری کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم بجا لاتا ہوں جو ہمارے اُن بھائیوں کی زبانوں پر بھی جاری ہو گئے ہیں جنہیں ہمارے طریق عمل سے مایوسی کی شکایت تھی۔ بلاشبہ نام نہاد اصلاحی کونسلوں کے سہ سالہ تجارب محصولِ نمک، پبلک سروس کمیشن اور مختلف محکموں کے ہندوستانی بنانے کے معاملات میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے۔ کینیا کے فیصلہ میں بھی ہم کوئی نئی ناانصافی نہیں پاتے بلکہ یہ ایک قدیم اور متوقع ناانصافی کا صرف تازہ اعادہ ہے۔ اس میں نسلی اور قومی تعصب کا جذبہ ہے اور وہ اب سے پہلے کب نہ تھا؟ اس میں برطانی مواعید کی شکست ہے اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کے بعد کم از کم برطانیہ کے "وعدوں" کی شکست میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی ہے اس میں ہندوستان کی عزت سے انکار ہے لیکن ہماری معلومات میں کوئی نظیر اس کے عزت و احترام کے اقرار کی بھی موجود نہیں، تاہم ان حضرات کے لیے ان معاملات میں ایسے انکشافات ہوئے ہیں جن کی تجربہ کی تکمیل اور حقیقت کے اعتقاد کے لیے ضرورت تھی۔ اب ان میں سے اکثر معترف ہیں کہ نام نہاد اصلاحات محض دھوکے کی ٹٹی ہیں اور ہندوستان کی خودداری کی حفاظت موجودہ حالات میں ناممکن ہے بغیر

برطانیہ کے ٹوٹے ہوئے وعدوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بائیکاٹ کے سوا چارہ کار نہیں ہے اور یہ کہ امپیریل نمائش کا ہندوستان کو پوری قوت کے ساتھ بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ حضرات! ہم اس موقعہ پر ہرگز اس بات کی شکایت نہیں کریں گے۔ کہ انہوں نے حقیقت کے اعتراف میں دیر کی۔ ہم یہ بھلا دیں گے کہ حقیقت اس تین سال سے پہلے بھی اتنی ہی بے نقاب تھی جس قدر فیصلہ کیا کے بعد آج نظر آرہی ہے۔ کیونکہ حقیقت کا اعتراف جلد کیا جائے یا بدیر لیکن بہرحال اعتراف ہے اور اس تحسین کا مستحق ہے جو اعترافِ حقیقت کے لیے ہونی چاہیے۔ ہم اُن سے صرف یہ کہیں گے کہ آپ کے وطن کو اب بھی آپ کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح تین سال پہلے تھی۔ اگر واقعی ہم سب کا اعتقاد ہے۔ کہ ہندوستان کی عزت کی حفاظت کا وقت آگیا تو کیوں نہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود بھی اس ایک مقصد میں متحد ہو جائیں کہ ہندوستان کی عزت بچائی جائے۔

حضرات! مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہوں گے وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پرجوش جذبۂ تہنیت کی ترجمانی کی عزت حاصل کروں جو آپ کی قومی جدوجہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پرفخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں آپ کی تاریخ کی ایک شاندار داستانِ عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق کے دو دور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے اور ایک کی فتحمندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنہیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کر دیا ہے کون ہیں؟ یہ ہندوستان ہے جس نے عین اس وقت جب کہ اُسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ درپیش تھا۔ خلافتِ اسلامی اور حکومت ترکی کی آزادی و خودمختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا۔ اور یہ ترکی ہے اور اس

کی جدید قومیت کا ظہور ہے جس کی انقلاب انگیز فتحمندیوں کا دنیا نے ایک زندہ جاوید معجزہ کی صورت میں مشاہدہ کیا ہے اور جس کی فتحمند حب الوطنی کی روح تمام سرزمین ہیں مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی۔

حضرات! ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے جب آپ نے اسی ایوان میں انگورہ کے حب الوطنوں کو ان فتوحات پر مبارک باد دی تھی جو ترکی فوجوں نے میدان جنگ میں حاصل کی تھیں، فی الحقیقت یہ فتوحات ایک آنے والی فتح عظیم کا پیش خیمہ تھیں۔ یہ جنگ کی فتوحات تھیں لیکن ان میں میدان سیاست کی ذہنی اور معنوی فتوحات کا پیغام مضمر تھا۔ یہ اس بے نقص اور بے داغ فتح کی ابتدائی قسط تھی جس کی تکمیل میں دنیا ایک گری ہوئی عظمت کے سنبھالنے کی جگہ ایک نئی عظمت کی تعمیر دیکھنے والی تھی۔ یہ گویا دنیا کے نام اعلان تھا کہ قوموں کی صفیں ایک نئی فتحمند قوم کے استقبال میں چشم براہ ہو جائیں۔ یہ فتح و ظفر کا ایک بے روک کوچ تھا جس کی راہ میں اگرچہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی طاقتیں اپنے بے پناہ منصوبوں اور اہم رکاوٹوں کے ساتھ حائل تھیں لیکن وہ اپنے جذبۂ حب الوطنی کے اچمبوں اور پر جوش بامیوں سے تاریخ کے لیے ایک پیام اعجاز لیے ہوئے بے خوف بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آگیا جب کوچ نے منزل پہ دم لیا اور تاریخ نے بڑھ کر اپنے دروازے کھول دیے تاکہ ایک نئی فتحمند قوم کا خیر مقدم بجالائے۔ گزشتہ جولائی کی چوبیسویں تاریخ کو جب لوزان میں ترکی صلح نامہ پر دستخط ہوئے تو فی الحقیقت ایک نئی قومی عظمت کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ ان تمام فتحمندیوں کی تکمیل تھی جن کی ایک قوم کو زندگی اور عزت کے لیے ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس میں فوجی فتحمندی سے زیادہ سیاسی فتح تھی، اور دونوں سے بڑھ کر وہ فکری اور معنوی فتح جن کے بغیر جنگ اور سیاست کی فتحمندیاں بھی ہیچ ہیں!

حضرات! اس فتح عظیم پر ہندوستان اپنی گرم جوش اور مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے جس قدر بھی نازاں ہو کم ہے۔ ہندوستان اس واقعہ کی صورت سے زیادہ اسکے

معانی کی وسعت کا رازشناس ہے۔ وہ ترکی کی فتح میں نہ صرف اپنے مطالب کی فتح بلکہ تمام سرزمینِ مشرق کی فتح کا نظارہ کر رہا ہے۔ میں سب سے پہلے حضرت خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ہندوستان کا یہ ہدیۂ ارادت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ پھر انگورہ کی قومی مجلس کو اس کے نئے جمہوری دور کی فتحمندیوں پر مبارک باد دیتا ہوں اور بالآخر ہم سب کی نگاہیں بے اختیار موجودہ عہد کی اس عظیم ترین شخصیت کی طرف اٹھ جاتی ہیں جس کا وجود فی الحقیقت ان تمام مبارک بادیوں کا مخاطب ہے، میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو ہندوستان کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں!

حضرات! میں نے ہندوستان اور ترکی کا ذکر کیا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مبارک باد کے اصلی مطالب سے ابھی عہدہ برآ نہیں ہوا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ کہ کسی سرزمین یا قوم کی نسبت سے محدود کی جائے۔ یہ کشمکش جو پانچ برس سے دنیا کی صلحِ عام کو ملتوی کر رہی تھی، محض قوموں اور حکومتوں کی جنگ نہ تھی۔ عصمت پاشا ایسے فتحمند مدبر اور لارڈ کرزن کی دھمکیوں میں صرف ترکی اور برطانیہ یا مغرب و مشرق ہی کی نمائندگی نہ تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز مضمر تھی۔ یہ دراصل اصولوں کی جنگ تھی اور متقابل عقیدوں کا معرکہ تھا۔ ایک طرف طاقت کا گھمنڈ تھا دوسری طرف حق اور انصاف کی بے سروسامانی تھی۔ طاقت کا دعویٰ تھا کہ کمزور قوتوں کو زندگی کا کوئی حق نہیں، انصاف کا عاجزانہ اعلان تھا کہ زندگی کا حق ہر اس قوم کو ہے جو زندہ رہنے کا ارادہ کر لے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے، عرصہ تک کشمکش جاری رہی بالآخر خدا کی مرضی نے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ طاقت کو باوجود اپنے تمام سروسامان شکست ہوئی اور انصاف نے اپنی ساری بے سروسامانیوں اور بے مایہ بیکسیوں پر بھی فتح پائی۔ پس فی الحقیقت ترکی کی فتح اس سے بھی زیادہ تر ہے کہ اسے ایشیا یا مشرق کی فتح سے تعبیر کیا جائے۔ وہ انصاف کی جیت ہے اور انصاف مشرق و مغرب کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے نہ کوئی قومیت، اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے

پس مجھے اجازت دیجیے کہ میں عالمِ انسانیت کی اس فتح پر تمام عالمِ انسانیت کو مبارک باد دوں میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارک باد دوں جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثنائے آزادیٔ عرب حاصل کر لیے گئے جن کا ترکی اور ہندوستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے جو ۱۹۱۸ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارہویں شرط یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائے گی چنانچہ آج ترکی کی سلطنت محفوظ ہے۔ برطانی وزیرِ اعظم نے کہا تھا کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کے زرخیز اور شہرہ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اب ترکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں نہ صرف ان "وعدوں" کا مفاد ہی موجود ہے بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں جو ان میں نہ تھیں۔ ان میں ترکی کی خود مختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز) اور غیر ترکی ڈاک خانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خودمختاری کی نفی کرتے تھے مگر اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ترکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا جائے گا۔ لیکن اب ترکی کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہم ان "وعدوں" میں دردانیال کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں لیکن صلح نامہ نے وہاں بھی ترکی کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے۔ بلاشبہ یہ جو کچھ ہوا وعدوں کا مفاد ہے۔ اور انصاف کی تعمیل ہے۔ لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجیے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے۔ اور طاقت کے وعدے بزورِ شمشیر فتح کر لیے جائیں تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دیدیتی ہے لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

حضرات! یہ صلح درحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دے گی۔ بلاشبہ انصاف پورا ہوا اور حق حقدار کو مل گیا لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا جنہوں نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنی اٹل اور بے روک سرکشی کی قسمیں کھائی تھیں؟ برطانیہ کو کیا ملا جو کامل چار سال تک اپنے ٹوٹے ہوئے وعدوں کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا، ظلم وجبر کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئی؟ اس نے ترکی کو پامال کرنا چاہا مگر وہ اس کے سیلے منصوبوں اور فیصلوں کے برخلاف طاقتور ہو گئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا۔ لیکن وہ تلوار کے آگے سربسجود ہو گئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے لیکن تلوار سے سب پارہ پارہ کر دیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلح نامے ترتیب دیے تو ہندوستان نے حق و انصاف کے نام پر فریاد کی مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا۔ لیکن جب مصطفےٰ کمال نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلح نامہ لکھ دیا تو وہ ایک مفتوح کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کر سکی ہمیں مورخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے کیونکہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ترکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ناکام ناانصافی کا ایک داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا مگر اب اس کے پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہو گیا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حوادثِ عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوئی ہے وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم در اصل ایک ایسے عہدِ انقلاب سے گزر رہے ہیں جو ٹھیک ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے جن میں مورخینِ عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پہلو کے لیے جھک رہی ہے۔ ان کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس

کے نقشے حدود اور خطوط بھی بل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اُٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہے۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے جس کے بعد صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل قریب کے دامن میں کیا ہے؟ تاہم جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیدار ہی تھی۔ اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگِ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح اس کے لیے مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے سحر کار ہاتھوں نے صرف ترکی کے بختِ خفتہ کو ہی بیدار نہیں کیا بلکہ مشرق کے دروازہ پر بھی دستک دیدی۔ اب اس کی گونج ایک طرف وسطِ ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحرِ ہند کی لہروں کو عبور کر چکی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند نہ ہو گی؟

حضرات! ہندوستان مشرق کی عام جدوجہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جدوجہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا رابطۂ یگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کر رہا ہے جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت اور مقصد کی یکسانی قدرتی طور پر پیدا کر دیتی ہے پس وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے جو انصاف اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور ہر اس قوم پر افسوس کرتا ہے جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے وہ مصر، شام، فلسطین، عراق، مراکش اور دیگر اقطاع مشرق کے تمام حب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ ان کی آزادی کو بھی اس سے کم محبوب نہیں رکھتے جس قدر

خود اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کو۔

علی الخصوص وہ "جزیرۃ العرب" کے استقلال و حفاظت کے لیے اپنے عہدِ قدیم کو آج پھر تازہ کرتا ہے۔ یہ مطالبات خلافت کی سب سے زیادہ اہم اور غیر مبدل دفعہ تھی جس کا ۱۹۲۰ء میں اس ایوان نے اعلان کیا۔ ہندوستان کے لیے یہ مطالبہ صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مذہبی اعتقاد اس سے وابستہ ہے بلکہ ہندوستان خود اپنی آزادی کے لیے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہندوستان، مصر اور عرب کی جغرافیائی اور طبعی حالت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ان کی سیاسی قسمت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی ہے اور ان میں ہندوستان کا وجود زنجیر کی پہلی کڑی کی طرح اپنے دونوں ہمسایوں کے لیے ہر چیز کی ابتدا ہے۔ یہ ہندوستان ہی کی غلامی ہے جس کو دائمی بنا دینے کے لیے ضروری ہوا کہ نہر سویز برطانیہ کے قبضہ سے باہر نہ ہو۔ اور اب عرب کا استقلال بھی صرف ہندوستان کی بدقسمتی پر قربان ہو رہا ہے۔ عرب جس کی آزادی ہندوستانی فوجوں ہی کے ذریعہ پامال کی گئی۔ اگر برطانی اقتدار کا ایک نیا ایشیائی مرکز بن گیا تو پھر ہندوستان کی غلامی کی سرحدیں بحرِ ہند ہی سے شروع نہ ہوں گی بلکہ ایک طرف شام کے ساحلوں پر اس کی دیوار کھڑی ہو جائے گی دوسرے طرف خلیج فارس سے گزر کر موصل اور دیارِ بکر کے حدود سے اس کا آغاز ہو گا۔ ہندوستان عرب کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہے کہ ان کا استقلال اور اجنبی اقتدار سے تحفظ اس کی جد و جہد کا اب بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے اعلان میں تھا۔ وہ اس وقت تک اپنی جد و جہد جاری رکھے گا جب تک عربی ممالک کا کوئی ایک گوشہ بھی اجنبی اقتدار سے آلودہ رہے گا۔

حضرات! جب کہ ہم ترکی فتح عظیم کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالی شان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں تو بے اختیار ہمارا خیال ہندوستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھری کے اندر ہندوستان کی

سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارک باد دی جائے تو وہ ہندوستان کے قائدِ اعظم مہاتما گاندھی ہیں مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں جنہوں نے اول نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کر لیا اور تمام ہندوستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔

حضرات! ہندوستان نے مہاتما گاندھی کی راہنمائی میں مطالبات خلافت کے لیے جو جدوجہد کی وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے جس کے نتائج پر تاریخ بحث کرے گی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں۔ تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں جو بلا کسی بحث و نظر کے ہم سب محسوس کر رہے ہیں اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدوجہد ظہور میں آسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندوستان کی آزادی ایک خواب پریشان سے زیادہ نہیں اسی کی بدولت اُن مشکلات پر غالب آگیا جو عرصہ سے اس کی راہ میں حائل تھیں۔

ہندوستان کا تمام مشرق میں وہ بین الاقوامی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقہ میں اسے ایک وقیع جگہ دے دی۔ اسی کا نتیجہ ہے اگر یہ جدوجہد وقوع میں نہ آتی تو آج ہندوستان کی تمام ایشیا اور افریقہ میں کیا حیثیت ہوتی؟ ترکی اور عرب کی آزادی اسی کی فوجوں کے ذریعہ پامال کی گئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تمام مشرق کی متفقہ نفرت اور حقارت اس کے حصہ میں آتی۔ جہاں کہیں بھی ایک ہندوستانی نظر آجاتا، انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ایک بدبخت ملک کا باشندہ ہے، جو صرف اپنی بدبختی پر قانع نہیں ہے بلکہ مشرق کی آزاد قوموں کے لیے بھی بدبختی کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج حالت بالکل پلٹ چکی ہے۔ آج ہندوستان سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن پر اس کی بے بسی نے جو دھبہ لگا دیا تھا اس کی مرضی اور اختیار نے اسے

دھو دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے ہزاروں ہندوستانی میدان جنگ میں گئے ہوتا کہ ترکوں اور عربوں کی آزادی کے خلاف تلوار اٹھائیں تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ خود اپنی مرضی اور خواہش سے ہزاروں ہندوستانی جیل میں گئے تاکہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ آج مشرق کے ایک ایک گوشہ سے ہندوستان کے لیے عزت و احترام کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ قسطنطنیہ میں اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے گویا وہ مشرق کی آزادی کا علمبردار ہے۔ قاہرہ کے بازاروں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ "اللہ ینصرک یا غاندی" (اے گاندھی خدا تجھے فتحمند کرے) یہ فی الحقیقت آزاد قوموں کی سی عزت ہے جو محکوم ہندوستان نے حاصل کر لی ہے اور یہ بلا شبہ اسی تحریک خلافت کا نتیجہ ہے۔

پھر ان دونوں نتائج سے بھی بڑھ کر جو چیز ابھرے سامنے آتی ہے وہ ہندوستان کا وہ حریت طلبانہ ذہنی ارتقا ہے جو اس جدوجہد کے ذریعہ اس نے حاصل کر لیا۔ کسی قوم کے آزاد ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی کا پورا اقرار شناس ثابت کرے۔ جس وقت ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی اور عرب کی آزادی محفوظ رہنی چاہیے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ خود آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ محکوم قوموں کی نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے نہ مرضی۔ اگر ہندوستان کی ترکی کے لیے کوئی مرضی ہے جس کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے تو پھر وہ اپنی آزادی کے کام سے بھی فارغ ہو گیا۔ کیونکہ آزادی کا حصول دراصل قوم کی مرضی کے نشوونما ہی کا نام ہے۔

حضرات! میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ چار سال کے اندر مطالبات خلافت کے لیے میں نے جو کچھ سعی کی اس کی نسبت میرا ذاتی احساس ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے بلکہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے یہ میرا قومی فرض ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان کی تحریک خلافت ہندوستان کی بڑی سے بڑی خدمت تھی جو تاریخ ہند کی اس عظیم شخصیت یعنی مہاتما گاندھی نے انجام دی ہے۔

حضرات! میں نے افتتاحی تقریر میں اپنے وقت کی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحادِ عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ۔ اس وقت ہم میں شرط کمزور ہو گئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آ گیا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیجیے اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہو تو عجب نہیں ہم ایک دوسرے خطرے سے دوچار ہو جائیں ......

.... آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا تو غفلت کی طرف اقدام ہو گا۔ اور اگر کم کر کے دیکھا تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے نہ خائف، ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں۔ اس راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کر لیں جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں لیکن بسا اوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگیز کرہ کی ایک ویسی ہی مخلوق ہیں جیسی ان گنت اور نامعلوم مخلوقات اس کی یکساں گردش کے ساتھ ظہور میں آتی رہی ہیں اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی کائناتِ ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے اور اگرچہ اس میں زندگی اور حرکت کے بیشمار مظاہر ہیں لیکن ان سب کے لیے اُن کے خالق کی مرضی کی طرح قانونِ حیات بھی ایک ہی ہے اس لیے اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے نہ اس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ

اور مختلف ہے جو کچھ ایک مرتبہ ہو چکا ہے وہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ اور جو ایک کے لیے ہوا ہے وہی سب کو پیش آتا ہے۔ وہ یکساں ہے، ہمہ گیر ہے، باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ ایران کے فلسفی شاعر "عمر خیام" کے لفظوں میں "اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جا رہی ہے" اور فرانس کے مشہور شاعر "وکٹر ہیوگو" کے زیادہ مختصر لفظوں میں "حوادثِ عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے"

حوادثِ عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانینِ حیات کی اس غیر مبدل یکانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے۔ اسی طرح مورخ کی نگاہوں نے مطالعہ کیا ہے اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں ہمیں چاہیے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد و اجسام کے لیے ہے ٹھیک ٹھیک اسی طرح جماعتوں اور عصروں کے لیے بھی ہے جس طرح افراد کا جسم ہے دماغ ہے اور وہ تمام قویٰ اور خواص ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے۔ دماغ ہے، نفسیاتی (سائیکولوجیکل) کیفیات ہیں جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گرد و پیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے بلکہ ان کی دماغی و جسمانی حالت میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا۔ اسی طرح جماعتوں کے اعمال و احوال میں بھی جماعتوں کا تشخص و تعین بالکل غیر موثر ہے۔ حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گرد و پیش سے تعلق رکھتے ہیں جب کبھی کسی جماعت کی ویسی ہی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گرد و پیش پیش آئے گا ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں۔ قوموں کا آغاز و انجام، عروج و زوال، غفلت و بیداری و محکومیت، فتحمندی و ناکامی، سب پر یہی قانون نافذ ہے، اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور ایک کے لیے ہوا ہے، بجنسہ وہی ہر قوم پر گزرتا

اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی عبرت انگیز توافق ہے جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مورخ عبد الرحمٰن ابن خلدون نے (جس نے سب سے پہلے فلسفہ تاریخ کے مبادیات و اصول مدون کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے "اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہٖ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں سے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا"! اسی حقیقت کو موجودہ زمانہ کے مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر گستاولی بان نے زیادہ جامع و علمی پیرایہ میں بیان کیا ہے "جب ہم جماعتی زندگی کے سائیکولوجی اس طرح مدون کر لیں گے جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کر لی ہے تو پھر ہمارے لیے ممکن ہو جائے گا کہ ہم ایک قوم اور تمدن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدن کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ بھی ہر سال یکساں طور پر کام دے سکے گی"!

حضرات! آج ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے اس قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔ صرف یہی بات ہمارے تمام بیجا تعجبوں اور بے جا اندیشوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہمیں آگاہ رہنا چاہیے کہ آج جو کچھ پیش آرہا ہے وہ نہ تو نیا ہے نہ معمول کے خلاف۔ بلکہ قومی جدوجہد کے اس مرحلہ کی جس سے ہندوستان گزر رہا ہے ایک بالکل قدیم، معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔ در اصل ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمیشہ گزر چکا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں جو ہم سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ہم کچھ نہیں ہیں مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہی جو اس قانونِ اجتماع کی یکسانیت کی بیشمار نظیروں پر ایک نئی نظیر کا اضافہ کرتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی ذہنی اور فکری حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن کا استعارہ مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے۔ ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب

دیکھتی ہے۔ جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے اور بالآخر جد وجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہے۔ پھر یہ جد وجہد ایک ایسا سفر ہے جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں اور ٹھہرے ہوئے رسم و راہ ہیں جو ضروری ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضروری ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گزرے۔ جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بے شمار ہیں اور جس طرح اس کی فتح مندی اٹل ہے اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ اس میں دماغ کے لیے بھی آزمائشیں ہیں اور جسم کے لیے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں۔ اس میں جا بجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ رک رک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں مگر ضروری ہیں اس کی فتح مندی قدم قدم پر نہیں ہے مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی ہے۔

حضرات! خدا کا یہ قانون حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطل نہیں ہو سکتا۔ ہم چلے ہیں تو ہمارے لیے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں اور ناگزیر ہے کہ ان سب میں سے گزریں۔ اگر ہماری تیز رفتاری رک گئی تو ہمیشہ رکا کرتی ہے ہمیں تیزی سے پھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو پڑا ہی کرتا ہے ہمیں از سر نو کوچ شروع کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہو سکے۔ یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں ہم کیوں نہ متفق ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک آزمائش ہے جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیے جس طرح باہمت قومیں غالب آتی ہیں لیکن اس سے زیادہ اس میں نہ کوئی ہراس ہے نہ مایوسی۔ یہ کوئی آسمانی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو، یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے جو ہماری طرح نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئے گا۔

آیئے۔ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصل سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشو و نما جب اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خالی وقت میں بھی اپنا اثبات کرے تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی متوثر کی ہوتی ہے جو فکر والے کے تمام انتشار و اختلاف پر غالب اگر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطہ اجتماع پیدا کر دے افراد کے دماغ جب جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہو جاتے ہیں تو ان میں عقل و ادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ ادراک سے جب ایسی حالت مہیا ہو تی جاتی ہے تو عملی جد و جہد ظہور میں آتی ہے اور بقدر اپنی قوت کے اُبھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معین حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اُسے رُک رُک کر جانا پڑتا ہے اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ردِ عمل REACTION کا قانون اپنا اثر دکھلاتے۔ اس وقت چاروں طرف ایک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اُس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک بندھن میں بہت سے بکھرے ہوئے اوراق بند ھے ہوتے تھے۔ یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور قومی جد و جہد کو ایک سخت آزمائش پیش آ جاتی ہے چونکہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے۔ اس لیے علم و ادراک اس میں بہت کم تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوش مند اور دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں لیکن اپنے جذبات کو ان حالات و نتائج سے نہیں روک سکتے۔ تاہم اگر جد و جہد کا دماغ اور پھیپھڑا محفوظ ہو تو یہ جو کچھ ہوتا ہے جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جد و جہد کی

زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن جونہی وہ مدت ختم ہوتی ہے جو اس نشۂ خمار کے لیے ضروری تھی معاً افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہو جاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رونما ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا۔ گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کرتی رہی تھیں۔ اب دوسرے ظہور میں تازہ قوت کے ساتھ پچھلی قوتوں کی مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی یا ختم ہو جاتے ہیں یا جاری رہتے ہیں۔ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جدوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھے گا۔

ہماری اس قومی جدوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آ گیا ہے۔ جدوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ یکایک بارڈولی کے فیصلہ نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ۔ وہ اچانک تھم گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا۔ اور اس سے وہ تمام نتائج پیدا ہوئے جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری جمعیت جنبش میں آ گئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلتی اور بکھرتی جا رہی ہے۔ جدوجہد کا عام سکون، کانگرس کا اختلاف، ہندو مسلم اتحاد میں فتور، اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات! یقیناً یہ ایک آزمائش ہے جس پر ہمیں فتحمند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑے گا۔ اور عجب نہیں کہ بڑی کشمکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کروں گا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و دماغ کے لیے قبول نہ کریں گے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی

نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو۔ یہ بالکل ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ایک آدمی کا دوڑتے دوڑتے ذرا رک جانا کہ دم لے کر پھر دوڑے ۔

ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چین ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اسی وقت اقرار کیا جاتا ہے جب وہ بالکل سامنے آجائے۔ لیکن خود ہم کو نہیں چاہیے کہ اپنی حقیقتِ حال کی نسبت کسی قسم کا شبہ قبول کریں۔ کیا ہے جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدوجہد کے تمام دماغی قوی پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی سستی سے کیوں گھبرائیں جب کہ اس کے دل کی حرکت میں کوئی سستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ کیا ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے اور روح کی طرح ہمارے جسم کے ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے ۔

حضرات! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آج سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کروں جو فی الحقیقت آپ کے یقین و احساس کی ترجمانی ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدوجہد قائم ہے۔ بدستور جاری ہے اور ہم ایک ایسے وقفہ کی حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کن معرکہ میں التوا ڈال دی ہے۔ مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہشیاری، سرگرمی اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا نا امیدی کا کوئی سوال در پیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجیے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو لیکن غفلت اور بدپرہیزی سے فوراً مہلک بنا دی جا سکتی ہے۔ آج جو آزمائش ہمیں پیش آئی ہے فی الواقعہ یہ ایک عارضی وقفہ ہے بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ

بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس کا جواب ہم سب کو معلوم ہے لیکن اس پر عمل دشوار ہو رہا ہے ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈھ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ؎

حضرات! آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمائش سے گزر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے۔ ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمائش کے نتیجہ کا تماشہ کریں۔ کیا ہم اس کی یادگاروں کا بہتر اور صحیح استعمال کریں گے؟ اس کا جواب ہمیں چوبیس گھنٹوں کے اندر دینا ہے ؎

حضرات! میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی مرحلے سے شروع کروں۔ ہم نے حصولِ مقصد کے لیے عدم تشدد اور ترکِ تعاون کا اصول اختیار کیا ہے ؎

"نان کوآپریشن" کی بنیاد دراصل دنیا کی اس سادہ مگر عالمگیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے اگر اس اصولی تعریف میں "برائی" کا لفظ "نقصان" سے بدل دیا جائے" (اور میرے خیال میں دونوں مترادف ہی سمجھنا چاہیے) تو پھر یہ نوعِ انسانی کا نہ صرف عالمگیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رجحان ہو جاتا ہے اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کو "ترکِ موالات" کا حکم دیا ہے، جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمہارے لیے قومی نقصان ہے تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ ہو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے ؎

قوموں کی سیاسی جد و جہد کے میدان میں دیکھا جائے جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے بلکہ متفقہ عمل ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کوآپریشن کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جد و جہد

کر کے حاصل کیے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور کشمکش ہے کو آپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومت سلبی یا سول ڈس او بیڈنیس بھی جو اس کے سب سے زیادہ قومی ہتھیار ہیں کوئی نئی تعلیم نہیں ہے مگر کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور ہوئی ہیں تو انہوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔ مذہب، اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ مصیبت برداشت کرلو مگر حق سے منہ نہ موڑو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی کمزوری اور بے کسی میں صرف یہی اصول ثبات وقرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط کے جام زہر میں دیکھتے ہیں یروشلم کی صلیب پر نقش پاتے ہیں اور مکہ کی گلیوں میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دو صدیاں تمام تر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم وستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں یہی اصول تھا جس کی غیر مسخر قوت اسے تھامے رہی۔ اسی عہد کے ایک مسیحی فدا کار ٹرٹلین کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے جو اس نے رومی عدالت کے ججوں کے سامنے بطور اپنے تحریری بیان کے پیش کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ ہم امریکن مصنف ڈریپر کی کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس میں پڑھ سکتے ہیں:

> "اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہم موجود نہیں؟ شہر، جزیرے، صوبے، قلعے، فوجی بارکیں، دربار کے محلات، سینٹ کے اجلاس، غرض کہ ہر اس مقام پر جو تمہارے اقتدار کی علامتیں ہیں ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز تمہاری عبادت گاہوں کے۔ ہم نے تمہارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو۔ اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان برپا ہو جائے۔ لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھلاتا ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں مگر مقابلہ نہیں کرتے۔"

اس سے زیادہ مکمل اور مؤثر اسپرٹ مقاومت سلبی کی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم چاہیں تو ستر ہ سو برس کے ان پرانے لفظوں کو بجنسہٖ آج بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

البتہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نا منصفانہ حکومت کے نظاموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور ایک دستور العمل کے اختیار کیا جائے، اور مسلح انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کر لی جائے، ایک ایسا خیال ہے جو غالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچے مسیحی مسلم کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی نے اپنی شہرۂ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے۔ اور اس قابلِ تعظیم کا دماغ در اصل مغربی تمدن کی بے روح مادیت، نظام ہائے معاشرت کی بے حد ناہمواری، سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی بے روک بے اعتدالی اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے بر خلاف ایک انتہائی پروٹسٹنٹ تھا۔ اور اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریات کی نسبت ہمیں امریکہ کے گزشتہ پریذیڈنٹ روز ویلٹ کے نقطہ چین لفظوں میں (جو اس نے ایک مرتبہ امریکن اوٹ لک میں لکھے تھے) ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کر گئی ہیں" تاہم اس کی تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل ہے، جس کی سادہ عملیت بالکل آشکارا ہے اور بلا شبہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتلِ انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے جو انہوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ٹک سکتے۔

ٹالسٹائی نے یہ دعوت بے شمار تحریروں میں دی ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "سوشل ایول" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس میں جا بجا اس کی صدائیں موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء

میں جب انارکسٹوں نے "ہمبرٹ" شاہ اٹلی کو قتل کیا تو اس نے ایک پیام تمام ان جماعتوں اور قوموں کے نام شائع کیا جو حقوق اور انصاف کے لیے انقلاب چاہتے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ظلم و استبداد کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل کیا جائے۔ یہ تو ایک مرض دور کرنے کے لیے دوسرا مرض لگا لینا ہے۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس نظام کی تائید ترک کر دی جائے جس سے تمام ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں"۔

یہ طریقۂ عمل بالکل صاف اور سہل ہے۔ مگر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا۔ وہ خاتمہ میں خود جواب دیتا ہے: "اس لیے کہ حکومتوں نے اپنے قیام و دوام کے لیے نہایت ہوشیاری سے پبلک کو مسحور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح سوئی ہوئی ہے کہ نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے پس اب ہمارا کام یہ نہ ہونا چاہیے کہ حکومتوں کا استبداد دور کرنے کے لیے قتل و خونریزی سے کام لیں۔ بلکہ چاہیے کہ اس جادو کو توڑ دیں اور لوگوں کو ان کی طلسمی نیند سے بیدار کر دیں"۔

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے۔ ہر آدمی کو معلوم ہے لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے واشنگٹن جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھی۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا۔ لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے چن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہو گئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نون کوآپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت کا راز اسے معلوم نہ تھا۔

ہندوستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نون کوآپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ تاہم بہت سی باتوں میں اس سے مختلف

بھی ہوگیا ہے پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ افکار وعقائد اور بہت سے نظام ہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا۔ لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو۔ یا ایسی دشواری رکھتی ہو جس کو ایک محدود وقت کے اندر قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔ عدم تشدد اس کی اصلی روح ہے لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جاسکتا تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کرلیا جائے۔ ان تمام تعلقات کو ترک کردینا جو ہندوستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں بلاشبہ اس کا اصل اصول ہے لیکن اس کا دائرہ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کردیا ہے اور جس قدر بھی ہے اس طرح عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار۔ ضبطِ نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصلی ہتھیار ہیں۔ تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا۔ جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور العمل بن گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ واضح، سادہ اور اس لیے عملی ہوسکتا ہے اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلح فتمندی کا یقین دلاتا ہے۔ اس میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے بلکہ عمل کی بھی دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے ؂

حضرات! نوان کوآپریشن کے پروگرام کی بعض دفعات کی نسبت ہم میں جو اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ وہ اگرچہ فی الحقیقت صرف اس کے ایک جزوی طریقِ عمل سے تعلق رکھتا تھا لیکن جب اس نے بحث ومباحثہ کی صورت اختیار کرلی تو جیسا کہ قاعدہ ہے طرح

طرح کے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ ہمارے موجودہ پروگرام کی نوعیت کا ہے۔ یہ پروگرام ایک مرتبہ عمل میں لایا گیا اور جس قدر نتائج اس وقت حاصل کر سکتا تھا اس نے حاصل کیے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے تمام معرکے ابھی باقی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں اس پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پروگرام تھا، جو صرف ایک ہی مرتبہ عمل میں لایا جا سکتا تھا اگر چل گیا تو چل گیا، نہیں تو پھر کسی دوسرے پروگرام کی جستجو کرنی چاہیے۔ یا نہ اخلاق اور مذہب کی دعوت کی طرح ایک دائمی اور غیر متغیر دعوت ہے جسے کسی غیر معلوم وقت تک کے لیے ہمیں کہتے رہنا چاہیے اور ہمارا مقصد اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام ملک یا ملک کا غالب حصہ اس پر پورا پورا عمل کرے گا۔ اگرچہ ایسا وقت کتنی ہی مدت کے بعد آئے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کر لینا چاہیے۔ میں سوال کے ان دونوں پہلوؤں کا جواب نفی میں دینا چاہتا ہوں وہ نہ تو اس معنی میں محض ایک ہنگامی اور ایک ہی مرتبہ تجربہ میں آنے والا عمل تھا جو سوال کے ایک پہلو میں نظر آتا ہے اور نہ اس معنی میں دائمی اور غیر تغیر پذیر جس کا رجحان دوسرے پہلو میں پایا جاتا ہے۔ دونوں انتہائی پہلو اختیار کر لیے گئے ہیں اور اصلیت دونوں کے درمیان ہے۔ اس میں اعتقاد کا استحکام بھی ہے اور دستور العمل کی تغیر پذیری بھی۔ فرض اور ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اس کے صاف صاف فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ اس پروگرام کے طریقِ عمل کی ترتیب پر غور کر لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اپنے خیالات آپ کے سامنے رکھ دوں جو نان کوآپریشن پروگرام کے اولین دن سے آج تک بلا تغیر میرے سامنے رہے ہیں۔ نان کوآپریشن کا پروگرام قبل اس کے کلکتہ کے اسپیشل اجلاس میں منظور ہو کر پوری طرح مرتب ہو چکا تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ

اسی دہلی میں مارچ ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ لالہ لاجپت رائے جی۔ حکیم اجمل خاں صاحب اور میں غور و مشورہ میں شریک تھے۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک مجھ پر کوئی وقت ایسا نہیں گزرا ہے جب مجھے اس کا خیال بھی ہوا ہو کہ یہ اس سوال کے دونوں انتہائی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کا نام ہے:

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی موجودہ مسلح بیوروکریسی کے مقابلہ میں غیر مسلح اور سلمی (نان وائلنٹ) جد و جہد کے ذریعہ ایسی فتحمندی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندوستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ ہم نے ہندوستان کی مرضی "کو خلافت" اور سوراج سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان ہیئت سے مخصوص نہیں بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی طرح ہندوستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ درپیش ہے وہ صرف یہ ہے کہ قوم کی مرضی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو؛

یہ غیر مسلح جد و جہد کیونکر عمل میں لائی جائے؟ تو بلاشبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظام حکومت کی شرکت عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہو کر اسے اس طرح گرا دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ کے ناقابل ہو جائے۔

اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، تجربہ اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ ہمیں اس ناانصافی کے لیے آلہ عمل نہیں بننا چاہیے جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔ اس اعتقاد سے کس انسان کو انکار ہو سکتا ہے، تجربہ اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کو اپریشن کر کے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے اور نہ کسی کو یہ متاع بطور عطیہ کے

ملی ہے یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے؟

شرکت عمل کی یہ علیحدگی اگر یک وقت پوری طرح عمل میں آجاتے تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ سورج کے ایک طلوع و غروب کے اندر ہندوستان کی تاریخ پلٹ جا سکتی ہے۔ لیکن کیونکر عمل میں آئے؟ اس آسانی کی ساری دشواری اسی سوال میں پنہاں ہے اس جنگ میں جو جنگ ہونے کے ساتھ بھی جنگ نہیں ہے اگر جنگ کی کوئی تیاری ہے تو یہی ہے:

میں دشواریوں کی تفصیل میں نہ جاؤں گا لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ انہی دشواریوں کا لحاظ رکھ کر اس نے ایسا طریق کار اختیار کیا ہے۔ جو تمام دشواریوں کو حل کر دیتا ہے وہ اپنی کامیابی کے لیے کسی ایسے وقت کا انتظار بالکل ضروری نہیں سمجھتا جب ملک کے تمام کمپاریٹر نوان کو اپریٹر ہو جائیں یا ایک بڑی اکثریت اس کے پروگرام پر عمل کرے۔ بلکہ اس نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس کے لیے صرف ایک خاص مقدار کا عمل کفایت کرتا ہے۔ اگر اتنی مقدار مہیا ہو جائے تو وہ گو بقیہ کا بھی خواہشمند رہے گا لیکن اس کے انتظار میں رکے گا نہیں:

صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا معرکہ۔ جنگ کے سر و سامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے، اور اس اسپرٹ کی جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے میدان کیلئے اسے ایسے مناسب تصادم کی ضرورت ہے جو اس کی سلبی رہازٹیو قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہو جائے اور جو بالآخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہلی غرض کے لیے اس نے وہ پروگرام اختیار کیا ہے جس میں وہ سرکاری درباروں تعلیم گاہوں اور عدالتوں سے نوان کو اپریشن کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ کواپریشن کی انہی بستیوں میں ایسے آدمی موجود ہیں جو دفتری اقتدار اور قومی جدوجہد

دونوں کے لیے بہترین سپاہی ہو سکتے ہیں. پس وہ ان کو بلاتا ہے. تاکہ ایک طرف حریف کے قبضہ سے اس کی بہترین فوج نکل جائے. دوسری طرف اس کی جنگ کے لیے بہترین سپاہی مہیا ہو جائیں۔ جب اس دعوت کے ذریعہ ایک تعداد فراہم ہو گئی تو گویا اس نے اپنی پہلی فوج تیار کر لی۔ اب یہی فوج اس کی تمام جدوجہد کے لیے اصلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کی تمام آئندہ امیدیں ملک سے نہیں بلکہ اسی جماعت سے وابستہ ہیں ؛

یہ پہلی فوج ایک طرف بلا انتظار جنگ شروع کر دے گی۔ دوسری طرف اپنی دعوت اور عملی نمونہ کی تاثیر سے وقتاً فوقتاً نئی نئی جماعتوں کو بھی اپنے میں جذب کرتی جائے گی ؛

دوسری غرض کے لیے اس نے مقاومت سلبی یا سول ڈس آو بیڈینس کا پروگرام اختیار کیا ہے۔ یہی اس کی اصلی جنگ ہے اور اسی پر اس کے مقصد کا فیصلہ موقوف ہے ؛

پس اس طریق عمل نے اس سوال کو بالکل غیر ضروری کر دیا ہے کہ تمام ملک نوان کواپریشن پر ایک معین وقت کے اندر عمل کر سکے گا یا نہیں، اور اگر ایک بڑی تعداد اس پر عمل کر کے عدالتوں اور کالجوں سے نکل بھی آئی تو ہم اسے اپنی جاری جنگ کے ہر وقت میں یکساں استقامت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ سکیں گے یا نہیں؟ اگر تمام ملک عمل نہیں کر سکتا تو نہ کرے اگر بہت سے لوگ اس پر عمل کر کے قائم نہیں رہ سکتے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نوان کواپریشن کو اس پر افسوس ہوگا۔ مگر ہراس نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ بطور ایک اعتقاد اور فرض کے سب کو بلاتا ہے لیکن بطور ایک جاری جدوجہد کے پروگرام کے وہ کسی ایسی مکمل اور یکساں حالت کا بالکل محتاج نہیں ہے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ جماعت کے اعمال عقل و استدلال کے تابع نہیں ہیں، تمام تر جذبات کی مخلوق ہیں۔ جماعت یا تو دوڑتی ہے یا بیٹھ جاتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ پس یہ ناگزیر ہے کہ اتار چڑھاؤ ہوتے رہیں جب کبھی ایک خاص طرح کی فضا پیدا ہو جائے گی ایک اشارے پر ہزاروں قدم دوڑنے آئیں گے پھر جب وہ بدلے گی تو بار بار کے بلاوے پر بھی ایک

قدم جنبش نہ کرے گا۔

ایسی فضا کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ صرف جنگ سے ۔ اس کی جنگ سول ڈس اوبیڈنیس ہے۔ پس اگر وہ کسی بات کے لیے فکرمند ہے تو وہ صرف اس کی پہلی اور مرکزی فوج ہے اس کے میدان کی فتح و شکست کا دارو مدار اس کی اخلاقی فتح و شکست پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پہلی فوج خواہ کتنی کم تعداد میں ہو لیکن اپنے اندر کمیت نہیں بلکہ کیفیت کی طاقت پیدا کرے وہ قوانین کو اپریشن کا اپنے آپ کو مجسم عملی نمونہ بنالے پہاڑ کی طرح اٹل اور سمندر کی طرح لبریز ہو جائے۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتی جائے۔ اور عملی نمونہ کی کشش اور گیرائی سے ملک کی غفلت اور اعراض کو شکست دے دے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر ایسی جماعت ملک میں قائم ہو گئی اور اس نے اپنی جنگ جاری رکھی تو یہ اس طرح کی کشمکش کے نفسیات کا قانون ہے کہ بہت جلد جنگ کے معرکوں کا موقعہ حاصل ہو جائے گا۔ اور جونہی ایسے معرکوں کی فضا پیدا ہوئی پھر خود بخود ہزاروں لاکھوں قدم اس کی طرف بن بلائے دوڑیں گے۔ اس کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں رہے گی۔

اگر پہلے مقابلہ میں وہ نتیجہ حاصل نہ کر سکی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہو گی کہ اب سپاہی اپنے بستروں پر واپس جاچکے ہیں۔ وہ اپنا کام جاری رکھے گی۔ اور اس وقفہ کو اس طرح خرچ کرے گی۔ تاکہ جلد از جلد دوسرے مقابلہ کے لیے فضا مہیا ہو جائے۔ پھر جب ایسی فضا مہیا ہو جائے گی۔ وہ مقابلہ کا اعلان کردے گی اور اس کو یقین ہے کہ وہ سب جو بستروں پر لیٹ چکے ہیں اچانک میدان میں کھڑے نظر آئیں گے۔

البتہ اس کا پروگرام بالطبع ایک محدود وقت کے اندر نتیجہ حاصل کر لینا چاہتا ہے لمبے لمبے وقتوں کا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اندازہ کیا تھا کہ پہلے مقابلہ کا نتیجہ سال بھر کے اندر نکل آنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ترتیبِ عمل کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس سوال کا

جواب خود بخود مل جاتا ہے جو موجودہ مباحثہ نے پیدا کر دیا ہے۔ سوال کے دونوں پہلو اصلیت سے منحرف ہیں۔ نہ تو یہ پروگرام کوئی ایسا پروگرام تھا جو صرف ایک مرتبہ عمل میں لا کر ترک کر دیا جائے اور نہ یہ صحیح ہے کہ نتائج اور حالات سے بالکل آنکھیں بند کر کے محض ایک اخلاقی اصول کی طرح اس کا وعظ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا نصف حصہ خود جنگ نہیں ہے بلکہ جنگ کے لیے سپاہیوں کی طلب ہے اور وہ ہمیں اس طرح بار بار کام دے گا جس طرح بار بار ہم فیصلہ کن معرکے گرم کریں گے بقیہ نصف اصل جنگ کا میدان مہیا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مرتبہ فیصلہ کن ہو۔

یہاں سے یہ بات بھی ضمناً واضح ہو گئی کہ نوان کواپریشن کی ذہنیت کی نسبت غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں وہ کس قدر دور از کار ہیں! کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے برخلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جد و جہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا وعظ ہے۔ وہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدم کی جگہ واپسی کی خواہش کی پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔

دراصل تمدن، تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہِ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہندوستان میں مغربی تہذیب و تمدن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں خود یورپ اور امریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب اُمنڈ آتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں لیکن نوان کواپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا وہ اپنے پیرؤں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے نہ ترکِ دنیا اور زہد و عبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستور العمل ہے جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہے۔ اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی

نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیم گاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو تو اس لیے نہیں کہ وہ یورپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس قدر اقتدار کا مخالف ہے جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہنو تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے اور نیز اس لیے کہ اُسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرزِ معیشت کی سادگی اور ضبطِ نفس کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

آیئے اب غور کریں ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟ ہم نے پروگرام کے پہلے حصے کے مطابق لوگوں کو بلایا۔ وہ آئے اور ایک پہلی اور مرکزی جماعت تیار ہو گئی۔ پھر اس کے دوسرے حصہ کے مطابق حالات نے جلد تصادم کی فضا بھی مہیا کر دی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے اب نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ یہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا؟

لیکن کامیابی کی جانچ کا ٹھیک معیار کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں دونوں کی کامیابی کا ایک معیار نہیں ہو سکتا۔ ایک تو نان کو اپریشن کا دستور العمل ہے۔ ایک ہماری وہ جدوجہد ہے جو اس پر عمل پیرا ہو کر ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر ہم اپنی جدوجہد میں اپنا آخری مقصد حاصل نہ کر سکے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی ذمہ داری دستور العمل کے سر عائد ہو۔ بحیثیت ایک عملی پروگرام کے اس کی کامیابی یہ ہے کہ تجربہ سے اس کے قابلِ عمل، موثر اور نتیجہ خیز ہونے کی شہادت مل جائے اگر ایسی شہادت مل جائے تو پھر اس کی کامیابی کے لیے کوئی بات نہیں رہ جاتی۔ اگرچہ ہمارے لیے کامیاب ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

باقی رہی ہماری جدوجہد کی کامیابی تو مجھے اس سے انکار ہے کہ اس کے لیے آخری مقصود کا پا لینا معیار ہو سکتا ہے، آخری مقصود کا پا لینا صرف کامیابی ہی نہیں ہے بلکہ آخری

کامیابی ہے اور ضروری ہے کہ اس سے پہلے متعدد کامیابیاں حاصل کر لی جائیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ کامیابیاں ہم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات! میں بلاکسی تامل کے یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ میرے یقین میں پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے جو کسی ایسے پروگرام کے لیے ہو سکتی ہے اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی تو اب وہ ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کر دی ہے۔

ایک منٹ کے لیے ان تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کو اپنے سامنے لائیے جو اس کی راہ میں حائل تھیں اس تھوڑے سے وقت کا بھی خیال کیجیے جو اس کو تعلیم، تیاری اور عمل تینوں منزلیں طے کرنے کے لیے ملا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ راہِ آزادی میں یہ ملک کا پہلا عملی قدم تھا۔ پھر دیکھیے کہ کیسے حیرت انگیز نتائج کا کیسا عظیم سلسلہ آپ کے سامنے موجود ہے! کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس کی ناکامیابی کا خیال بھی کر سکیں؟ اس کی کونسی بات ہے جس پر عمل نہ ہو سکا اور کونسا عمل ہے جس نے کامیاب اثر نہیں دکھلایا؟ کیا بے شمار آدمیوں نے سرکاری انسٹی ٹیوشنوں کو نہیں چھوڑا۔ کیا ان تمام دنیوی فائدوں اور راحتوں سے دست بردار نہیں ہو گئے جو انہیں حاصل ہو رہی تھیں؟ کیا تمام ملک میں ایثار اور قربانی کا عام ولولہ نہیں پیدا ہو گیا۔ کیا ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل خانوں میں نہیں چلے گئے۔ کیا حکومت کا پورا مسلح نظام اس سے عاجز نہیں آ گیا کہ پرنس آف ویلز کے ورود کے موقعہ پر ہڑتال کی ایک دکان کا تختہ بھی کھلوا سکے۔ کیا ۱۹۲۱ء کی ہر صبح اور ہر شام نے اس کی شہادت نہیں دے دی کہ ہندوستان میں بھی قوم کی مرضی ہے اور وہ میدان میں نمایاں ہو سکتی اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہو سکتی ہے۔

قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندوستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں

کی سیاسی استعداد دفعتاً بلند کر دی۔ برِ اعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچا دیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کر دیے۔ راہِ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشہ گاہ بن گئیں بغرض کہ آزادی کی جد وجہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک پر نہ کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہیے کہ پروگرام صحیح ہے۔ عمل ہے اور اپنی تاثیر میں بے خطا ہے؛ نوان کوپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائے گا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے ایسی طاقت پیدا کر سکتا ہے جو دفتری اقتدار کے لیے ناقابلِ تسخیر ہو گی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

اگر سوال کیا جائے کہ ہماری جد وجہد میدانِ جنگ میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکی؛ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں دسمبر ۱۹۲۱ء کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جب دفتری اقتدار نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ نافذ کر کے ڈیفنس سول ڈس اوبیڈنس کی راہ صاف کر دی تھی۔ فی الحقیقت یہی جد وجہد کا اصلی معرکہ تھا۔ میں اس کی تاریخ کا یہ واقعہ یہاں ثبت کرتا ہوں کہ ۴ر دسمبر کو مقابلہ شروع ہوا اور ابھی دو ہفتے پورے نہیں گزرے تھے کہ دفتری اقتدار پر شکست کے آثار طاری ہو گئے حتیٰ کہ اسے مجبوراً جد وجہد کی طاقت کا کھلا اعتراف کرنا پڑا اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ التوائے جنگ یا صلح کے لیے آمادہ ہو جائے چنانچہ وہ بالکل تیار تھا کہ جد وجہد سے ایک مقابل حریف کی طرح معاملت کرے۔ دونوں میں سے کسی فریق کے لیے ہار جیت کا سوال نہ ہو، دونوں عارضی طور پر اپنی اپنی کارروائیوں کو ملتوی کر دیں۔ گورنمنٹ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کا نفاذ اٹھا لے اور قیدیوں کو رہا کر دے۔ کانگرس پرنس آف ویلز کے ورود کا مقاطعہ ملتوی کر دے۔ اس کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو اور وہ جد وجہد کے مطالبات پر غور کرے۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے

۳۱ دسمبر کو کلکتہ میں ایک دفاع کا جواب دیتے ہوئے اُنھی نشہ الکٹ پر زور دیا تھا اور بار بار طلب و تمنا اور صلح و صفائی کے لیے ایسے لب و لہجہ میں جس کا دفتری اقتدار کبھی عادی نہیں ہوا۔ اپنی انتہائی خواہش ظاہر کی تھی کہ التوا اور صلح کی صورت نکل آئے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اسے جد وجہد کی کوئی بہت بڑی فتحمندی سمجھتا ہوں۔ ہمارا مقصد بلند ہے اور ضروری ہے کہ اسی مناسبت سے ہماری کامیابی کا معیار بھی بلند ہو۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی چیز ہے کہ ہم سے صلح کی ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی جس کے ساتھ کوئی وعدہ نہ تھا۔ البتہ میں اسے جد وجہد کی ابتدائی کامیابی ضرور یقین کرتا ہوں اس نے دکھا دیا کہ ہمارا طریق عمل کس قدر زور داتر اور بے خطا ہے اور کس طرح وہ دو ہفتہ کے اندر اغماض اور گھمنڈ کی جگہ اعتراف اور طلب کی تبدیلی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

حضرات! ہر قومی جد وجہد کی تاریخ میں جہاں اس کی بہت سی باتیں یادگار ہوتی ہیں وہاں چند غلطیوں کا بھی ذکر ضرور ملتا ہے۔ ان غلطیوں کا ہونا گویا اس طرح کی حالت کی ایک قدرتی بات ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ بار دولی کا فیصلہ ہماری جد وجہد کے لیے ایک ایسی ہی غلطی تھی۔ ہم اس پر اپنے تاسف کو تو روک نہیں سکتے لیکن ہم اسے اس طرح محسوس کرتے ہیں گویا ایک ہونے والی بات تھی۔ اس سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے تھے۔

دراصل بار دولی کے فیصلہ پر ہماری جد وجہد کا پہلا فیصلہ کن معرکہ ختم ہو گیا۔ اور اس وقت سے ہم ایک ایسے وقفہ جنگ کی حالت میں ہیں جس میں جنگ تو قائم ہے لیکن مقابلہ کے لیے وقفہ پیدا ہو گیا ہے۔

حضرات! گزشتہ جنوری میں جب جیل سے رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری خدمت یہ ہے کہ اس اختلاف کے دور کرنے کی کوشش کروں چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر کر کے کوئی خاص جانب اختیار کرنے سے

پرہیز کروں۔ اس لیے مجھے اس وقت تک کوئی موقع نہیں ملا کہ اصلی مسئلہ کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کرتا۔ آج پہلا موقع ہے کہ اس بارے میں زبان کھولتا ہوں۔ اس اختلاف نے دو جماعتیں قائم کر دی ہیں، ان دونوں میں میرے ایسے محترم احباب موجود ہیں، جن کی قابلیت اور خدمت کی میرے دل میں ویسی ہی عزت ہے جیسی ہر باشندۂ ہند کے دل میں ہونی چاہیے تاہم یہ بات اس سے مانع نہیں ہو سکتی کہ میں اپنے خیالات کو صاف صاف عرض کر دوں۔ کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں تو علاوہ ادائے فرض کی کوتاہی کے یہ اُس اعتماد کا بھی صحیح استعمال نہ ہوگا جو آج آپ نے مجھ پر ظاہر فرمایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس اختلاف کی نسبت میں عرض کروں گا یہ ہے کہ اول روز سے جس قدر اہمیت اس مسئلہ کو فریقین کی جانب سے دی گئی ہے مجھے کلیتہً اس سے اختلاف ہے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دراصل ہماری تمام موجودہ مشکلات کی اصل بنیاد اسی غلطی میں پنہاں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں یہ اختلاف اصول کا ہے یا فرع کا؟ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر؟ اگر وہ اختلاف اصول کا اختلاف ہے تو بلاشبہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات و استقامت اس میں ظاہر کریں۔ نرمی اور در گذر کی اس میں گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کثرت و قلب رائے کا سوال اس کے لیے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن کا سوال بھی اس پر مؤثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے تو پھر صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنی رائے میں کمزور ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہیے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں گے، کوئی بڑی مصلحت سامنے آجائے گی تو اس چھوٹی چیز کو اس پر قربان بھی کر دیں گے۔ جماعت کا ساتھ۔ مجازنی کا اتباع، نظام کا ڈسپلن، سب اس سے اوپر رہیں گے۔ اس کے لیے چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔ عزم اور ثبات یقیناً انسان کے لیے اولی درجہ کے اوصاف ہیں مگر اسی

حال میں جب کہ اپنے صحیح محل پر خرچ کیے جائیں اور صحیح تعداد میں خرچ کیے جائیں میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا اختلاف نوان کواپریشن کے لیے قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ نوان کواپریشن بحیثیت ایک اصول کے کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام کی دفعات ہیں جن میں کالج، عدالت اور کونسلوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ یقیناً وہ سرکاری کالجوں کو چھوڑ دینے یا کونسلوں کے ووٹروں کو ووٹ دینے سے روکنے ہی کا نام نہیں ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر کوئی چیز ہے اور وہی نوان کواپریشن ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف نوان کواپریشن میں نہ تھا۔ اس بارے میں نہ تھا کہ ہمیں کونسلوں میں اشتراکِ عمل کے لیے جانا چاہیئے یا نہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہمیں اصلاحی کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا یا اس میں تبدیلی کرنی چاہیے؟ میں بالکل یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ نوان کواپریشن کی مضبوط سے مضبوط پابندی کے ساتھ کیوں اس بارے میں دو رائیوں کی گنجائش نہیں ہے؟ یہ تو صرف پروگرام کی ایک دفعہ کا اختلاف تھا۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ کیوں پورے پروگرام کی تبدیلی و عدم تبدیلی کا سوال بھی نوان کواپریشن کے لیے ایک اصولی سوال سمجھا جائے؟ نوان کواپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ پس جب ایک شخص نے اس سے اتفاق کیا تو وہ نوان کواپریٹر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرح یہ بات بطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے؟ تو اس کے لیے جو کچھ بھی ہم طے کریں گے وہ ضرور واجب العمل ہے۔ لیکن بہرحال اصل نہیں ہے۔ فرع ہے۔ مقصود نہیں ہے وسیلہ ہے اور اگر اس میں اختلاف رائے ہو تو وہ کبھی اس اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے۔

آزادی ہمارا مقصد ہے، عدم تشدد اور نوان کواپریشن ہمارا اصول ہے اور حصولِ مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے، مقصد ہے، ہم

اعتقاد نہیں بدل سکتے، ہم اصول نہیں ترک کر سکتے۔ لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لمحہ تبدیلی کر سکتے ہیں اگر اس تبدیلی سے ہمیں انکار ہوگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کر لی گویا یہ ایک اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس پر اس قدر قوت خرچ کی گئی گویا قومی جد وجہد کا جینا مرنا اسی پر موقوف ہے۔ ایک طرف سے کہا گیا کہ یہ خود نان کوآپریشن کا اختلاف ہے حالانکہ اگر نان کوآپریشن کا اصول اس قدر تنگ مان لیا جائے تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ دنیا میں نان کوآپریشن کا کوئی عمل چند دنوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ دوسری طرف اس بات پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کی متحدہ قوت کا تفرقہ گوارا کر لیا جائے حالانکہ اگر اس طرح کے جزئی اختلاف کی بنا پر تفریق اور جماعت بندی درست تسلیم کر لی جائے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

بہر حال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا جس کی خاطر ہم اپنا اتحاد، اپنی سرگرمی اور اپنا وہ سب کچھ جو ہم نے حاصل کیا ہے، خطرہ میں ڈال دیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگریس میں آپ نے خواہ یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہیے خواہ یہ کیا ہوتا کہ ان پر قبضہ کرنا چاہیے۔ جو کچھ بھی ہوتا لیکن اگر آپ متفق رہتے تو آج ان مشکلات کا نام و نشان نہ ہوتا جن کی وجہ سے جد و جہد کا ایسا قیمتی برس جیسا کہ ۱۹۲۳ء ہے بالکل ضائع گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے فتور کا بھی اصلی باعث کیا ہے؟ میں عرض کر دوں گا صرف آپ کا یہ اختلاف اور اختلاف کی وجہ سے ملک کی بیکاری لوگوں کے لیے جب وہ اصلی کام باقی نہ رہا جس میں سب کے دل اٹک گئے تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ آپس میں ٹکرانے لگیں آپ جب کہ طریق عمل کی ایک خاص صورت کے لیے اس قدر طاقت خرچ کر رہے ہیں تو ایک لمحہ کے لیے اس حقیقت کو بھی تو یاد کر لیجیے کہ کامیابی کا دار و مدار محض ہتھیاروں اور راستوں کی نوعیت پر

نہیں ہے بلکہ خود فوج کی طاقت پر ہے۔ یہ بات کہ ہتھیار کیسے ہوں، ایک دوسرے درجہ کا سوال ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ سپاہی کیسے ہوں اور ان کی اخلاقی حالت کیسی ہو۔ ہتھیار کے لیے صرف اتنا ہی دیکھ لینا بس کرتا ہے کہ کاٹ رکھتا ہو۔ اگر وہ بہتر قسم کا نہیں ہے تو مضائقہ نہیں فوج میں ایکا اور مضبوطی ہونی چاہیے۔ ایک متحد فوج خراب ہتھیاروں کے ساتھ بھی کامیاب ہو سکتی ہے لیکن اچھے سے اچھے ہتھیار بھی منتشر اور بیدل سپاہیوں کو جیت نہیں دلا سکتے۔ ہم ایک برس سے صرف اتنی بات پر لڑ رہے ہیں کہ ہتھیار کیسا ہو، لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ فوج کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اگر فوج ہی منتشر ہو گئی تو آپ کو اچھی سے اچھی بندوق بھی کیا کام دے گی؟ مان لیجیے کہ کاؤنسلوں کا بائیکاٹ ہی سب سے بڑا کام ہے۔ یا کاؤنسلوں پر قبضہ کرنے میں دنیا جہان کی فتح ہے۔ تاہم جب آپ کی کوئی متحدہ طاقت ہی نہ رہی۔ آپ کا نظام الٹ گیا۔ کسی قومی مرکز کا ڈسپلن قائم نہ رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد میں رخنے پڑ گئے تو فرمایئے آپ بائیکاٹ کیونکر کریں گے؟ کاؤنسلوں کی نشستوں پر کیونکر قابو پائیں گے؟

حضرات! ہمارے لیے محافظت کی اصلی چیز جزئیات نہیں ہیں، اصول ہیں۔ پس یہ کسی طرح صحیح طرزِ عمل نہ ہوگا کہ ہم کسی جزئی مسئلہ کے جوش میں اس قدر دور چلے جائیں کہ اس کی وجہ نئے نئے اصولوں کے قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور وہ آگے چل کر ہمارے لیے اصولی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس اختلاف نے جب دو جماعتیں قائم کر کے فریقانہ بحث و نزاع کی شکل اختیار کر لی تو یہ ناگزیر تھا کہ افراط و تفریط کی طرف میلان پیدا ہو لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے اپنے دل و دماغ کی نگہبانی کریں۔ ہمیں کبھی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دینی چاہیے۔ لیکن ہمیں ہمیشہ اطاعت (ڈسپلن) میں مضبوط رہنا چاہیے۔ تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا حدِ اعتدال سے گزر جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن و دماغ سے کام لے محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بن جاتا ہے۔ مذہب اور علم دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی و سعادت کے لیے سب سے بڑی روک

ثابت ہوئی ہے اور ہمیں کبھی نہیں چاہیے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں۔ برخلاف اس کے اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی و کامیابی کے لیے روک ہے اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے مگر خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے کٹ جائیں لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت ہو جائے ؛

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمران جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں، ہمیں چاہیے کہ خواہ کانگرس کا فیصلہ ہو یا ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کی رائے ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی گورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہیے۔ جو جماعت تبدیلی کی مخالف ہے وہ اس میں احتیاط نہیں کرتی کہ کہیں تقلید جمود کی طرف قدم نہ بڑھ جائیں اور جو جماعت تبدیلی پر مصر ہے وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتی کہ ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے ہمیں اپنے نظام کے ڈسپلن سے باہر نہ ہونا چاہیے ؛

حضرات! مجھے اب اجازت دیجیے کہ میں موجودہ حالت اور آئندہ طریقِ عمل کی نسبت اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں میرا یقین ہے کہ ہندوستان کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی ایک سچی رہنمائی ہے اور اگر ہندوستان آزادی اور نجات حاصل کر سکتا ہے تو صرف انہی کی رہنمائی سے ہندوستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں۔ یا موجودہ حالت پر قانع رہے یا مسلح انقلاب کرے یا نوان کواپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پہ قانع نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ سچائی ہے اور وہ نوان کواپریشن ہے۔

باقی رہا اس کا پروگرام، تو اس وقت تک کوئی بات ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی ہے۔

جس کی وجہ سے کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ البتہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمارا پہلا مقابلہ ہو چکا۔ ہم اس وقت ایک وقفہ جنگ کی حالت میں ہیں اور ہمیں آئندہ مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہمارا فیصلہ کن مقابلہ بجز سول ڈس اوبیڈینس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس سول ڈس اوبیڈینس سے بالکل قطع نظر بھی کر لیں جب بھی ہمیں ڈیفنسو سول ڈس اوبیڈینس کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔

البتہ اس کے لیے ایسے حالات کی ضرورت ہے۔ جن میں سے بعض تو ہماری تیاریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض کا تعلق تمام تر دفتری اقتدار کے طریق عمل سے ہے۔ ایک خاص طرح کا طریقِ عمل وہ اختیار کرے۔ جب کہیں وہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ مثلاً وہ جبر و تشدد کے ذریعہ ہماری سرگرمیوں کو روکے، یا قوانین کا غلط استعمال کرے، جیسا کہ پچھلے موقعوں پر اس نے کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں مطمئن رہنا چاہیے کہ موجودہ حالات کے قدرتی قوانین ہمارے حق میں ہیں۔ ہمیں صرف یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم صحیح راستہ پر ہیں بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا مقابل فریق گمراہ ہے اور یہ ایسے مقابلہ کی طبیعت ہے کہ گمراہ حریف کو ٹھوکریں لگیں۔ ہندوستان میں آج دفتری اقتدار کے افراد اور ہندوستانیوں کے دماغ کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ ایک غلط نظام اور ایک صحیح مطالبہ میں مقابلہ ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس سے غلطیوں پر غلطیاں ہوں اور ضروری ہے کہ قومی جدوجہد نئی طاقتیں اور مہلتیں حاصل کرے۔ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنی تیاریاں قائم رکھیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ایسی فضا پھر پیدا ہو جائے گی کہ ہم اپنا دوسرا فیصلہ کن معرکہ شروع کر سکیں گے جونہی معرکہ شروع ہو گا۔ پھر از سرِ نو سپاہیوں کے لیے کشش پیدا ہو جائے گی۔ ہم دیکھیں گے کہ بستر خالی ہو گئے ہیں اور میدان پھر سے بھر رہا ہے۔

لیکن یہ وقفہ کیونکہ اس طرح بسر کیا جائے کہ جلد سے جلد مقابلہ کے لیے مناسب فضا مہیا ہو جائے، اور ساتھ ہی ہماری موجودہ مشغولیت کے لیے بھی مفید ہو، کیا اس وقفہ کے لیے بہتر

ہوگا کہ ہم موجودہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں یا یہ کہ جہاں کہیں اکثریت کے ساتھ کونسلوں میں جا سکتے ہیں جائیں اور انہیں بھی نوان کو اپرشن کی سرگرمیوں کا ایک عارضی گوشہ بنالیں ؎

حضرات! حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر چیز نہیں ہو سکتا جس طرح گزشتہ انتخاب کے موقعہ پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم نشستوں پر قبضہ کر لیں۔ اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جد وجہد کا ایک گوشہ بن جائیں

میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے۔ دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو۔ یہ بات قطعی طور پر طے کر دی جائے کہ کونسلوں میں جانا ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت ہے۔ جو کانگرس قرار دیدے اس پروگرام میں صاف طور پر تمام باتیں موجود ہیں۔ جو ہمارے طرز عمل کو شرکت عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ یہ قطعی ہے کہ وہاں جاکر کوئی زیادہ مدت تک کام جاری نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارا مقصود کسی حال میں بھی شرکت عمل نہیں ہے اگرچہ بظاہر اچھے کاموں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی بالکل صاف کر دینی چاہیے کہ کسی چھوٹی سی چھوٹی مدت کے لیے بھی نہ ہاں کسی عہدہ کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی خواہ کسی نیت ومقصد سے ہو ؎

اب رہی یہ بات کہ کونسلوں میں جاکر کیا طرز عمل اختیار کیا جائے گا؟ تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اور بہت کچھ یہ وقت کے حالات پر موقوف ہے۔ تاہم ایک بات تو بالکل واضح اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مناسب موقعہ پر نوان کو اپریٹر ممبروں کو کونسلوں سے باہر آنا پڑیگا اور باہر کی جماعت کے ساتھ مل کر سول ڈس اوبیڈنس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

کونسلوں کا داخلہ ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس مقابلہ کی تیاری کے لیے

بمقابلہ بائیکاٹ کے اسے بھی گوشہ جنگ بنالینا زیادہ مفید ہے۔ اگر آج ظن غالب پیدا ہو جاتے کہ ہم وقفہ کی جگہ مقابلہ کی حالت میں ہیں تو کم از کم میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ رائے نہ دوں گا کہ کونسلوں میں جانے کا خیال بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گو میں گیا پروگرام کی طرف سے بالکل مایوس تھا تاہم جب تک ذرا بھی امید اس کی کامیابی کی جاسکتی تھی۔ میری کوشش یہی رہی کہ سب مل کر اسے کامیاب بنانے کی سعی کریں اور کونسلوں میں جانے کا کوئی خیال سامنے لائیں۔ بہر حال اگر ہم چاہیں تو انتخاب کے بعد کا پروگرام آج ہی بنا لے سکتے ہیں۔ چاہیں تو اسے آئندہ سالانہ اجلاس پر موقوف کریں۔ یہ آخری صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ باہر کا کام کیا ہو یہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور اسی پر اس نئے گوشہ جنگ کا مفید ہونا موقوف ہے۔ اس بارے میں حسب ذیل امور پر آپ کو توجہ دلاؤں گا؟

۱۔ تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام از سر نو شروع کرنا چاہیے تفصیلات کی طرف میں ابھی آپ کو توجہ دلاؤں گا۔

۲۔ ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم جن سے غافل رہ کر ہم آئندہ کوئی کام نہیں کر سکتے

۳۔ عوام کی سیاسی تعلیم، تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہم کو اپنی جدوجہد کی گزشتہ سرگرمی، جس تیاری، بلاوا اور مقابلہ سب کام بیک وقت کرنا پڑے لیکن موجودہ وقفہ میں ہمیں اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قومی اتحاد نوان کو اپریشن، عدم تشدد، اور سول ڈس اوبیڈینس کے اصول و مقاصد عوام کے دلوں پر نقش کردیں۔ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ خالص جذبہ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھیں۔

بکثرت ہندوستانی زبانوں میں لٹریچر تیار کر کے تقسیم کرنا چاہیے۔ کانگریس کمیٹیوں کے ورکر اور والنٹیر قصبوں اور دیہاتوں میں دورہ کریں۔ ہر جگہ جم کر اسی طرح تعلیم دیں گویا عارضی سیاسی تعلیم گاہیں ہر طرف کھل گئی ہیں۔ اسی کام کا ایک پروگرام تین مہینے یا چھ مہینے کا بنالیا جائے۔ ہم اتنے عرصہ کے اندر تمام ملک کو ایک خاص مقصد کی تعلیم دے سکتے ہیں اگر حکومت

کی جانب سے اس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ مفید ہوگا۔ عجب نہیں کہ اسی کے ذریعہ سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا ہو جائے :

۴۔ تعمیری پروگرام کا بقیہ حصہ :

البتہ میں یہ بات بالکل صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے کونسلوں میں دخلہ کی صرف ایک ہی صورت صحیح ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگرس نہ صرف اس کی اجازت دے بلکہ خود اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ لیکن اگر آج آپ کا فیصلہ اس کے برخلاف ہو تو جیسا کہ میں یہ تفصیل عرض کر چکا ہوں پھر ہم میں سے کسی فرد یا جماعت کو بھی نہیں چاہیے کہ اس کے خلاف قدم اٹھائے۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ ہے جس کے لیے ہم قومی نظام کی اطاعت سے باہر ہونے پر مجبور ہو سکتے ہیں اگر آج بھی آپ کا فیصلہ یہ ہو کہ کونسلوں کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیے تو اس صورت میں میری رائے یہ ہو گی کہ بائیکاٹ کو داخلہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارے کام کے لیے اصلی چیز متحدہ جدوجہد ہے۔ جو راہ ہم سب مل کر اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ ہر منفرق قدم سے بہتر ہو گی اور جب تک اصول اور اعتقاد کا سوال نہ آئے ہمیں اپنے نظام کی اطاعت سے باہر نہ ہونا چاہیے :

حضرات! گیا کے موقعہ پر علمائے اسلام کی کانفرنس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ مسلمانوں کو کونسلوں کے لیے کھڑے ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔ دراصل مذہبی نقطہ خیال سے ان کے سامنے ترک موالات کی اصل تھی اور جہاں تک طریق عمل کا سوال ہے قدرتی طور پر ان تمام طریقوں سے انکار ہونا چاہیے۔ جن سے اصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات کہ کونسلوں میں جانا اس کے لیے مفید ہے یا مضر؟ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر وہی لوگ رائے قائم کر سکتے ہیں جنہیں ان معاملات کا تجربہ ہے لیکن اس وقت خود ان لوگوں میں اختلاف تھا بس ضروری تھا کہ حضرات علماء اسی پہلو کو اختیار کریں جس میں احتیاط ہو۔ بصورتِ اختلاف احتیاط اسی میں تھی کہ احتراز کیا جائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج آپ اس

بارے میں ایک مطمئن فیصلہ کریں کے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی جانب سے اس معاملہ میں اصرار ہو۔

حضرات! میں نے آپ کا اس قدر وقت درو دیوار کی نکر میں لے لیا۔ حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جد وجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے؟ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی۔ تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندوستان کے عشق و محبت کا ایک ذرہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہے اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا انتظار کرے لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش بر آواز ہے ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ رشتہ مندی اور اپنے مجنونانہ کشت و خون کی اس کے لیے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اور تبلیغ اور سنگھٹن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملے سے حفاظت کرو جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بد نصیب ہندوستان کی حفاظت کا ولولہ کب قائم رہ سکتا ہے ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات ابھارے

جارہے ہیں دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندوستان کی سڑکوں پر بے دریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر، میرٹھ، سہارنپور، آگرہ، پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہوچکے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوسناک ہوں گے ؟

حضرات! میں آج ان تمام لوگوں سے جو ان جذبات کی تبلیغ کر رہے ہیں، صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت ناقابلِ برداشت ہے میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں میں کہتا ہوں کہ ہم آزادی کی طرف جارہے ہیں۔ آپ ہمارا راستہ نہ روکیئے اگر آپ روکیں گے تو ہمارا فرض ہے کہ رکاوٹوں سے راستہ صاف کریں۔ میں آپ تمام حضرات سے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہیں اور اپنے اندر ہندوستان کا دماغ اور ہندوستان کی زبان دونوں رکھتے ہیں یہ عرض کروں گا کہ آج آپ اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ نوان کو ابر یٹرز کونسلوں میں جائیں یا نہیں تو مضائقہ نہیں لیکن خدارا آج اس کا فیصلہ کر کے یہاں سے اٹھیے کہ ہندوستان اپنی آزادی و نجات کی زخمی امیدوں کو بچائے رکھے یا آگرہ اور سہارنپور کی خون آلود سرزمین میں دفن کر دے، آج آپ کو صاف صاف اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور اپنی تمام قوتیں اس کے لیے صرف کر دینی چاہئیں اگر آپ ایک دن کے لیے بھی اسے برداشت کریں گے تو یقین کیجیے کہ برسوں کیلئے آپ کا سفر پیچھے پڑ جائے گا ؟

حضرات! ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کانگرس کی سیاسی حرکت میں شریک نہ تھے۔ مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندوستان میں ان کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہوں گے تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے ؟

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اس سے واقف ہوں گے کہ ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلی

صدا میری صدا تھی جو اس طرزِ عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں۔ کانگریس میں شریک ہوں۔ ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں اور فرقہ دار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی۔ لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آگیا جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا جب سنہ ۱۹۱۶ء میں میں رانچی میں نظر بند تھا تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں ؛

حضرات! جس طرح میں نے سنہ ۱۳ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ میں حیرت سے محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی۔ ٹھیک ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سنائے جا رہے ہیں وہی اسباب و بواعث آج بھی ان کی زبان پر ہیں مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ ان کی تعداد کم ہے اور آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے۔ نہ مسلم سنگھٹن کی ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ "انڈین نیشنل کانگرس" ہے ؛

میں اس وقت اس معاملہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا جو دلائل ان تحریکات کی تائید میں بیان کیے جاتے ہیں مجھے ان کی صحت سے بالکل انکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ فلاں فلاں سنہ میں فسادات ہوئے اور ان میں ایک فریق کا نقصان زیادہ ہوا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنا علیحدہ سنگھٹن کر لے ؛

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریق استدلال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستان کی ہر جماعت اپنے نقصانات کی ایسی ایک فہرست تیار کر سکتی ہے اور اس کے بعد سنگھٹن کا اعلان کر دے سکتی ہے۔ اگر بمبئی کے گزشتہ بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو کئی فسادات ایسے ملیں گے جو خود مسلمانوں کے دو فرقوں میں ہوتے ہیں اور ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ کو اچھی طرح لوٹا اور قتل کیا ہے۔ البتہ میں اس بات کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور کے بعد ملتان میں فساد کا ہونا اور وہاں کے مسلمان بلوائیوں کے ہاتھ سے ہندوؤں کو سخت نقصان پہنچنا ایک ایسا افسوس ناک حادثہ ہے۔ جس پر ہر مسلمان کے دل پر زخم لگنا چاہیے۔ تاہم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں اور ابھی ابھی نئی زندگی کے دور میں داخل ہوتے ہیں اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بیجا مذہبی جوش کا ابھر آنا کچھ دشوار نہیں ہے ایسے حوادث ناممکن نہیں کر دیے جا سکتے۔ اس کا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ پیدا نہ کریں جس کی زیادتی ہو، اسے ملامت کی جائے جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بنا کر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہو جائے۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ہندوستان کی ہر جماعت کو اپنی اندرونی اصلاح و درستگی کے بیشمار کام درپیش ہیں اور ضروری ہے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے کوشش کرے۔ لیکن میں اس سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسی تحریک اس حالت میں قائم ہو سکتی ہے۔ جب کہ اسکا خمیر فرقہ وار فسادات اور باہمی جنگ کے خون سے مہیا کیا گیا ہو۔

اس تحریک کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سنا دیتے ہیں میں ان

حضرات سے کہوں گا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے لیکن اب فطرتِ انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجیے۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی نہ بخش سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں ؟

اِس طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت یہی عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وار کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے ہیں لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں ہندوستان میں ایک طرف سے کچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا ؟

حضرات! میں ملک کی تمام جماعتوں سے عرض کروں گا کہ انہیں ایک مرتبہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان آزادی و نجات حاصل کر لے تو پھر انہیں اور تمام کام اس کے لیے ملتوی ہی کرتے پڑیں گے خواہ وہ کام انہیں کتنے ہی محبوب ہوں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں ؟

میں آج اس پلیٹ فارم سے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کا گہوارہ ہے تمام ہندو مسلمانوں سے وطن کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی امیدوں کو اس بیدردی کے ساتھ پامال نہ کریں اور بلا اس بحث کے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے آئندہ کے لیے ان تمام سرگرمیوں کو بند کر دیں جو شدھی موومنٹ اس کی مدافعت اور فرقہ وار تحریکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر بند کر دینے کے لفظ سے وہ متفق نہیں ہو سکتے تو کم از کم ملتوی کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ تمام عالم انسانیت کی ایک سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے ؟

حضرات! اس سلسلہ میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجیے کہ اب ہمیں اس باب میں

تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان کے لیے ایک میثاق قومی طیار ہوجائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روزمرہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کردے۔ اس اعتبار سے ہندوستان ایک عجیب ملک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تیس کروڑ انسانوں کی آزادی صرف اس لیے تاخیر میں پڑجائے کہ کسی مسجد کے سامنے سے ایک جلوس ڈھول بجاتا ہوا گزر گیا۔ یا کسی راستہ کے درخت کی شاخ کاٹ ڈالی گئی۔ پس جب ملک کی مصیبتوں کی نوعیت کا یہ حال ہے تو ہمیں ان مسائل کے قطعی اور دائمی فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ منتخب افراد کی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کردی جائے۔ اور آئندہ اجلاس سے پہلے ایک مسودہ تیار کرلے۔

خاتمہ:- حضرات! قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں۔ آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی ہمارے حصے میں آسکتی ہے۔ ہمارے عزم ہمارے ثبات اور ہماری حب الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ آئیے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

آل انڈیا خلافت کانفرنس ـــــــ کانپور

۲۹ر دسمبر ۱۹۲۵ء

قوموں اور جماعتوں کی نوعی زندگی کے تغیرات کی رفتار بہت ہی سست ہے۔ گھنٹے کی سوئی کی طرح اس کی حرکت مشاہدہ میں نہیں آتی اگرچہ منٹ کی سوئی کی طرح وہ بھی متحرک ہے۔ تغیر کے ایک نقطہ سے لے کر دوسر نقطہ تک پہنچ سکنے کے لیے بسا اوقات قرنوں اور صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہمارا محدود ناقص علم اس گوشہ کا بھی احاطہ کر سکتا تو ہم قوموں اور جماعتوں کے تمام احوال کو اسی نظر سے دیکھتے جس نظر سے ایک طبیب بیمار کا جسم اور ایک حکیم النسان کے دماغی خواص دیکھتا ہے ؂

حضرات! یہ دوسرا موقعہ ہے کہ آپ نے خلافت کانفرنس کی صدارت کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں جب اس کا اجلاس ناگپور میں ہوا تھا۔ آپ نے یہی خدمت میرے سپرد کی تھی۔ اب پانچ سال کے بعد دوبارہ مجھے موقع دیا ہے کہ آپ کے اعتماد اور محبت کا شکریہ ادا کروں ؛

پانچ سال کی یہ مدت انسانی عمر کی کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ زمانہ کی غیر معلوم مگر طویل و عظیم عمر کا تصور کیجیے تو یہ پانچ برس اس کے ناپیدا کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ ہستی نہیں رکھتے۔ تاہم غور کیجیے تو نظامِ شمسی کی انہی پانچ گردشوں کے اندر انقلاب و تغیر کی کتنی گردشیں دنیا پر گزر چکی ہیں! انقلاب کا ایک کامل دور ہے جو ذہن اور جسم کے ہر گوشہ میں طاری ہے۔ جنگ عظیم گویا اس انقلاب کی پکار تھی۔ اب خود انقلاب تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا ہے۔ ماضی کے نتائج ایک نئے مستقبل کے لیے ڈھل رہے ہیں۔ اور مستقبل جلد جلد اپنے آثار و علائم بھیج رہا ہے ؛

آج اس محل میں ہماری بحث و نظر کا دائرہ ہندوستان اور عالمِ اسلامی کے اندر محدود ہے۔ لیکن جغرافیۂ عالم کے ان گوشوں کے حوادث بھی اس کے لیے کافی ہیں کہ ایک انقلاب انگیز عہد کے تاریخی خواص ان میں تلاش کیے جائیں ؛

جدید ترکی کا ظہور اور نشوء نما، مصر کی سیاسی حرکت کا اتار چڑھاؤ، مشرق میں یورپ کے طامعانہ استعمار کا نیا دور۔ عراق، شام اور فلسطین کی انگریزی فرانسیسی عملداری، عثمانی خلافت کا اختتام، خاندان عثمانی کا ترکی سے اخراج، شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی پے در پے فتحمندیاں، حجاز کے ناگہانی اور فوری تغیرات، شریف حسین کی خود ساختہ امارت کا خاتمہ، امیر ابن سعود کا داخلہ حجاز، جزیرۃ العرب میں ایک نئی سیاسی صورت حال کی پیدایش، شام میں قومی حرکت کا طاقتور ظہور، خاندان قاچار کا خاتمہ اور پہلوی شاہیت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو اس قلیل عرصہ کے اندر گزر چکے اور گو ان کی انقلابی اہمیت ہم نے اپنی روزانہ زندگی کی مشغولیت میں محسوس نہ کی ہو لیکن تاریخ ان کے اندر قرنوں اور صدیوں کے تغیرات کا سراغ لگائے گی ؛

یہ تو ہماری دلچسپی کا بیرونی منظر تھا۔ لیکن ہم کسی حال میں بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتے کہ ہمارے لیے زندگی اور سرگرمی کی اصلی جگہ خود اپنی سرزمین اور وطن ہی ہے۔ غور کیجئے! اس پانچ سال کے اندر یہاں کی دماغی و جماعتی حالت میں بھی کیسی کیسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا ہمارے ملک کے مستقبل میں ان کے اثرات کیا کیا اور کس طرح کام دیں گے، خلافت کی حرکت کے ساتھ ہی ملک کی آزادی و استقلال کی جو متحدہ حرکت شروع ہوئی تھی اور جس کی خصوصیتوں نے بہت جلد دنیا کی توجہ اور دلچسپی حاصل کر لی تھی، ایک خاص منزل تک پہنچ کر رک گئی۔ اور اس کے بعد اس کے رد فعل (ری ایکشن) کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے، بیداری کی جگہ غفلت ہے۔ اتحاد کی جگہ انتشار ہے، ملک و قوم کی جگہ فرقہ اور جماعت کی صدائیں ہیں اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ اور درد انگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ

اس کا مقابلہ کیا جائے جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی و ترقی کی طرف جا رہی ہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف ٹھٹک ہی نہیں گیا ہے بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے افریقہ کے مٹھی بھر قبائل جب آزادی کی حفاظت کی راہ میں فرانس اور اسپین کی متحدہ طاقت کو پے در پے شکستیں دے سکتے ہیں اس کے لیے ہندوستان اپنی اتنی وسیع آبادی کے ساتھ جو موجودہ نسلِ انسانی کا پانچواں حصہ ہے اپنی جہالت و غفلت کو بھی شکست نہیں دے سکتا۔ ہندوستان کی طرح شام بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترک آبادی ہے۔ وہاں کے دروزی قبائل، عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلاف کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں ہی کا افسانہ کافی ہے جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ کر خشک ہو چکے ہیں تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ یہ ہے " الدین للہ والوطن للجمیع " وطن سب کے لیے ہے اور ہر شخص کا دین اس کے لیے۔ لیکن ہندوستان کا حال کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ مذہبی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ دارانہ تنگ دلی اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں!

جہاں تک مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے ۱۹۱۲ء کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء کا خاتمہ ہر اعتبار سے مختلف ہے اگر انہی دو مخالف سمتوں سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ گزشتہ حرکت کا سب سے زیادہ نمایاں اور موثر پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں متحدہ مقصد کے لیے متحدہ جدوجہد کی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ان کی پراگندگی نظم اور انضباط سے آشنا ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کے موجودہ دور میں پہلی مرتبہ بمقصد اقوام، فرض اور ایثار کی راہ میں قدم اٹھایا۔ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں وہ ملک کی سرگرمی میں اپنے برادرانِ وطن سے بہت پیچھے تھے۔ اس حرکت نے مسلمانوں کے قدم بھی میدان کی طرف اٹھا

دیے۔ لیکن موجودہ حالت بالکل اس سے متضاد ہے گزشتہ حرکت جو پوری تیزی کے ساتھ جاری تھی اچانک رک گئی اور اس صدمے سے ان کی جمعیت بھی بکھر گئی۔ اب نظم اور انضباط کی جگہ ہر طرف پراگندگی ہے۔ افکار پریشان ہیں۔ طبیعتیں غیر مطمئن ہیں۔ یقین اور اعتقاد ہل گیا ہے اور لوگ محسوس کر رہے ہے کہ کوئی راستہ ان کے سامنے موجود نہیں۔ عام طور پر ملک میں غفلت و گمراہی کی جو آب و ہوا پیدا ہو گئی ہے وہ خود بھی اسی میں بہ رہے ہیں اور حالت کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے الگ ہو کر اپنے فکر و دماغ کی درستی کی انہیں مہلت نہیں ملتی۔ اگر فکر اعتقاد کی کوئی قوی اور بالاتر روشنی موجود نہ ہو تو اس تاریکی کا لازمی نتیجہ سرگردانی اور حیرانی ہے چنانچہ یہ سرگردانی ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔ بہت سے لوگ کسی غیر معلوم اور غیر معین راہ کی جستجو میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کوئی نیا قدم اٹھانا چاہیے۔ لیکن کس طرف اور کس طرح؟ اس کا جواب خود انہیں معلوم نہیں جب کہ عام حالت ایسی ہو رہی ہے تو کچھ تعجب انگیز نہیں اگر جا بجا جہل و فساد کے بہت سے سوتے ہوتے فتنے پیدا ہو گئے ہیں۔

حضرات! یہ تمام صورتِ حال کتنی ہی افسوس ناک کیوں نہ ہو۔ لیکن یقین کیجیے ان قدرتی قوانین کے ماتحت کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے جو افراد کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی اس دنیا میں نافذ ہیں۔ یہ علم و حقیقت کا صریح انکار ہو گا اگر ہم مرعوب ہو کر سراسیمہ ہو جائیں۔ جس طرح ایک فرد پر اس کے جسم و دماغ کی مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ حالتیں اس درجہ عام او یکساں ہیں کہ ان کا علم و احساس کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے۔ جسم کی صحت اور بیماریاں دماغ کا نظم اور اختلال، جذبات کا سکون اور ہیجان، ہمارے لیے زندگی کے عام اور قدرتی حالات ہیں۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا بھی ہے۔ ان کا بھی ایک مجموعی اور نوعی دماغ ہے اور اس کے لیے بھی نظم و اختلال اور سکون و ہیجان کی مختلف حالتیں ہیں۔ البتہ فرد کی زندگی شب و روز ہم پر گزر رہی ہے۔ اور

ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس کے اندر قوانین زندگی کی کارفرمائی محسوس کر رہے ہیں۔ مگر قوموں اور جماعتوں کی نوعی زندگی کے تغیرات کی رفتار بہت ہی سست ہے۔ گھنٹے کی سوئی کی طرح اس کی حرکت مشاہدہ میں نہیں آتی اگرچہ منٹ کی سوئی کی طرح وہ بھی متحرک ہے۔ تغیر کے ایک نقطہ سے لے کر دوسرے نقطہ تک پہنچنے کے لیے بسا اوقات انہیں قرنوں اور صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہمارا محدود و ناقص علم اس گزشتہ کا بھی احاطہ کر سکتا۔ تو ہم قوموں اور جماعتوں کے تمام احوال کو اسی نظر سے دیکھتے جس نظر سے ایک طبیب بیمار کا جسم اور ایک حکیم النسان کے دماغی خواص دیکھتا ہے۔

ہندوستان کے اس پورے آباد رقبہ کو ایک فرد کی طرح تصور کیجیے اور مجھے جواب دیجیے کہ کائنات ہستی کے اس وجود کو بھی وہ سب کچھ کیوں نہ پیش آئے۔ جو ہمیشہ ان حالات اور ان ظروف میں پیش آتا رہا ہے۔ اور جب تک خالق کائنات کی مرضی ہو گی پیش آتا رہے گا۔ یہ وجود بیمار ہے اور اسے تندرستی حاصل کرنی ہے۔ بیماری کے اسباب ایک نہیں بے شمار ہیں نئے نہیں پرانے ہیں۔ صرف بیرونی نہیں اندرونی بھی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان سب کے نتائج ظاہر ہوں اور ناگزیر ہے کہ بار بار اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ بیماری اگر پرانی اور تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہے تو علاج کی کوششوں کو بھی اسی مناسبت سے اپنے اندر صبر اور برداشت پیدا کرنی چاہیے۔ کیوں ہم علاج کی کسی ایک کوشش کی ناکامی یا بیماری کا کوئی ایک سخت ظہور دیکھ کر گھبرا جائیں! اگر علاج منظور ہے تو ہمیں ایک طبیب کے علم اور ایک تیماردار کی برداشت کے ساتھ اس وقت تک کام جاری رکھنا پڑے گا، جو حکمت الٰہی نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ ہم ایک فرد کی معمولی سی بیماری کے لیے بھی یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ کب تندرست ہو جائے گا۔ باوجودیکہ جسمانی صحت کے قوانین ہم نے منضبط کر لیے ہیں۔ پھر ہم ایک پوری قوم کے علاج میں کسی ایسے معجزانہ نتیجہ کے کیوں منتظر ہوں؟ اور ایک ابتدائی کوشش کی ناکامی یا نتیجہ کی تاخیر کیوں ہمیں سراسیمہ کر دے ہم مرض کی کہنگی اور شدت پر غمگین ہوں گے لیکن

صحت کی طلب میں ہمارے جو عقائد اور یقین ہیں۔ اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے ۔

حضرات! یقیناً ملک کی موجودہ صورتِ حال ہر محبِ وطن کے لیے انتہائی غمگینی کا سامان ہے۔ لیکن میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر اپنی حیرت ظاہر کروں گا کہ مایوسی یا انقلابِ عقائد کا سامان کیوں ہو؟ کیا ہم نے ملک اور قوم کی نجات و ترقی کی راہ میں قدم نہیں اٹھایا ہے؟ کیا کروڑوں انسانوں کے ذہن و عمل کے انقلاب کا عظیم دگرانبار کام ہمیں درپیش نہیں؟ کیا مذہب، تاریخ، زبان، اقوام و رواج، تہذیب اور معاشرت کے گہرے اختلافات اور جہل و غفلت کی بے شمار خرابیاں ہماری راہیں حائل نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مرض صدیوں سے موجود ہے۔ اور علاج کی عمر چند برسوں سے زائد نہیں؟ یہ چند برس بھی قوموں کی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ چند ایام ہیں اگر ان صاف اور سادہ سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اعتقاد، یقین اور علم کی روشنی موجود ہو۔ ہم نے ایک بے خبر اور ناآشنا آدمی کی طرح قدم نہ اٹھایا ہو جسے مشکل متحیر کر دیتی ہے اور ہر رکاوٹ پر وہ ہمت ہار کر بیٹھ رہتا ہے۔ حالات کی تبدیلی، کوششوں کی ناکامی، مشکلوں اور رکاوٹوں کی کثرت سے ہماری کوششوں کی صورت اور مقدار میں تبدیلی ہونی چاہیے لیکن ہمارے عقائد اور اصول کیوں بدل لیں؟ اگر ہندوستان کی نجات کی راہ میں غفلت و فساد نے نئی نئی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اعتراف کریں۔ کہ اب منزل زیادہ دور ہو گئی اور کام اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جس قدر ہم نے سمجھ رکھا تھا لیکن یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ آزادی ہمارے لیے غیر ضروری ہو جائے! غلامی کی زندگی پر ہم قانع ہو جائیں! اور اس کی پہلی شرط یعنی باہمی جنگ و پیکار کا فیصلہ کر لیں! علم اور روشنی کے ہر کام کی طرح ضروری ہے کہ اس راہ میں بھی ہمارے سامنے کچھ بنیادی اصول ہوں۔ اگر وہ موجود ہیں تو اصول میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔

حضرات! حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہماری سرگرمی کا ایک دور ختم ہو چکا ہے مگر

دوسرا ابھی شروع نہیں ہوا۔ اس لیے درمیانی وقفہ کی اداسی اور پریشان حالی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ جلد از جلد ایک نیا دَور شروع ہو۔ اور ہم از سر نو اپنی تمام بکھری ہوئی قوتیں کسی ایک مرکز پر جمع کر لیں۔ ہمیں چاہیے کہ نہ تو گزشتہ پہ ماتم کریں نہ حال کے ہمت شکن نظاروں سے افسردہ ہوں بلکہ قدم اٹھائیں۔ اور امید کے ایک نئے آغاز پر دستک دیدیں! ؎

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتح بابِ شنوم

حضرات! ایک ایسے وقت میں آپ نے مجھے دوبارہ صدا دی ہے آپ میں سے اکثر احباب اس بات سے بے خبر نہ ہوں گے کہ میں کئی سال سے اس کوشش میں ہوں کہ صرف اپنی قلمی مشغولیت ہی کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میری طبیعت کا یہ میلان محض میرے ذوق طلب ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ میرا یقین ہے کہ میرے لیے وقت کی تمام قومی خدمات میں یہی خدمت سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ گزشتہ پانچ سال کے اندر میں نے بار بار کوشش کی کہ قومی مجالس کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ کام بھی جاری رکھوں۔ لیکن تجربے سے معلوم ہو گیا کہ بغیر یکسوئی کے ممکن نہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر فیصلہ کرنا پڑا کہ ان سرگرمیوں سے بالفعل کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ اور اگر ان میں حصہ لینا بھی چاہیے۔ تو صرف اسی حد تک جہاں تک میری قلمی مشغولیت کا ضروری انہماک اجازت دے۔ اس حالت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ مجھے اس نئی ذمہ داری کی قبولیت میں تامل ہوتا، مجھے تامل ہوا۔ لیکن بالآخر جب میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ اپنے فیصلہ پر وقت کے تقاضا کو ترجیح دوں اور تسلیم کر لوں کہ ہم خدمت گزاران قوم کے لیے اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت کا فیصلہ ہو۔ ہمیں اپنے اور اختیار کی بہت سی چیزوں کی طرح اپنے فیصلہ کے حق ترجیح سے بھی دستبردار ہو جانا چاہیے چنانچہ

میں نے آپ کی دعوت منظور کر لی اور اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں آیئے اپنی طلب و سعی کا سفر از سر نو شروع کر دیں۔ ہمارا سفر قوموں اور ملکوں کا سفر ہے ہمیں انسانی اولوالعزمی اور فیروز مندی کی طرف جانا ہے۔ ہمیں اپنی گم گشتہ سعادت کا سراغ لگانا ہے۔ ہمیں اپنی راہ سے بے شمار رکاوٹیں دور کرنی ہیں ہمیں خطروں اور مصیبتوں کے بیابان طے کرنے ہیں خدارا مجھے جواب دیجیے کیا ایسے عظیم و گراں بار مقصد کے لیے راہ کی درازی اور سفر کی تھکن محسوس کی جاسکتی ہے؟ ہم ابھی چلے ہی کتنے ہیں کہ ستانے کے لیے بیٹھ جائیں؟ ہماری یہ چند برسوں کی حرکت قوموں کے سفر کے لیے بمشکل چند قدم تھی۔ اگر ہمیں موت سے زندگی، پستی سے بلندی، اور ذلت سے شرف و عظمت کی طرف پلٹنا ہے تو نہیں معلوم ایسے کتنے ہی سفر پیش آئیں گے۔ اور ہر مرتبہ ہمیں نئے عزم اور تازہ ہمت کے ساتھ اٹھنا اور بڑھنا پڑے گا۔ اگر ہم مقصود سے غافل نہ ہوں اور صرف سفر ہی جاری رکھیں تو یقین کیجیے۔ اس راہ میں چلتے رہنا ہی بجائے خود مقصود ہے ؎

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

کیا ہم فی الحقیقت بڑھنے کے لیے تیار ہیں؟ میں سمجھتا ہوں اس کا صحیح جواب وہ نہ ہوگا جو آج ہماری زبانیں دیں گی۔ بلکہ وہ ہوگا جو سال آئندہ کے خاتمہ پر ہماری صورت حال دے سکے گی، اب ہمیں اعلان و دعویٰ ختم کر دینا چاہیے، اور عمل کے لیے مستعد ہو جانا چاہیے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

حضرات! اس قدر تمہیدی کلمات ناگزیر تھے۔ اب آپ اجازت دیں کہ پیش نظر مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ نہایت مختصر ہے میں چاہتا ہوں جہاں تک ممکن ہو آپ رسم و نمائش کی جگہ حقیقت اور عمل کی طرف متوجہ ہوں، میری جانب سے اس راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ خطبۂ صدارت کے روایتی امتیاز و نمائش سے اپنی دستبرداری

کا اعلان کرتا۔ یہ سالانہ تصنیف و انشاپردازی کی محض نمائش ممکن ہے ملک کے ادبی ذخیرہ میں کچھ اضافہ کا موجب ہوتی ہو۔ لیکن اپنے محل اور وقت کے لیے تو قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس کا غیر ضروری ہونا ہی اس کی ناموزونیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے سننے کا بوجھ حاضرین کے لیے کس درجہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے جبکہ وہ غیر دلچسپ بھی ہوتا ہے۔ ایک تحریر جو لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی موجود ہوتی ہے اور جسے ہر شخص اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھ سکتا ہے صرف اس لیے تین تین اور چار چار گھنٹہ تک پڑھی جاتی ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح رسم پوری کر دی جائے میں نے قومی مجالس کی تلخی ہمیشہ محسوس کی ہے اور میں اسے گوارا نہیں کروں گا کہ خود بھی آپ کے لیے اس تلخی کا موجب بنوں۔ بلاشبہ میں محسوس کرتا ہوں کہ وقت کے متعدد مسائل بحث و بیان کے مستحق ہیں لیکن میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ اس قومی مجلس کا وقت جو نظر و بحث کے لیے نہیں بلکہ عملی تدابیر کیلئے ہے ان مباحث کے لیے کیوں حاصل کروں اخبار و رسائل کے ذریعہ تحریر و اشاعت کا موقعہ ہمیشہ حاصل ہے۔ پس یہاں مجھے آپ سے جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ آئندہ بارہ مہینے کے لیے ہماری جد و جہد کا پروگرام کیا ہونا چاہیے؟

لیکن حضرات! خواہ ہم وقت کے احتساب میں کتنی ہی سختی کریں۔ تاہم سالِ رواں کے بعض اہم حوادث ایسے ہیں جن کی یاد سے اپنے دلوں کو اس وقت نہیں روک سکیں گے۔ دیش بندھو چترنجن داس کی وفات ہمارے ملک کا ایک نقصانِ عظیم ہے۔ وہ ملک کے ان سیاسی رہنماؤں سے ایک تھے جن کی ذات ہر ملک و قوم کے لیے موجب فخر ہو سکتی ہے۔ ان کی رہنمائی سے ملک ایسے وقت میں محروم ہوا جبکہ ان کے تدبر "حب الوطنی" اور متحدہ قومیت کے سچے اور مضبوط اعتقاد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ سر سریندر ناتھ بنرجی کے انتقال سے بھی ہندوستان کی سیاسی شخصیتوں میں سے ایک دوسری شخصیت کی جگہ خالی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیسا ہی مسلک اختیار کیا ہو تاہم ملک کی سیاسی زندگی کی پیدائش میں ان کی طویل خدمات تاریخ ہند میں اپنی جگہ حاصل کر چکی ہیں۔ سال رواں میں ملک کا موجودہ

نظامِ حکومت بدستور اپنے جابرانہ خواص کی نمائش میں سرگرم رہا۔ اور ہندوستان اپنی غلامانہ زندگی کی بے لیسی برابر محسوس کرتا رہا۔ جنوبی افریقہ میں ایشیا ٹک بل کا معاملہ اس حقیقت کا ایک تازہ ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ ہندوستان کی غلامانہ زندگی نے اس کے فرزندوں کی ذلت و مصیبت آخری درجہ تک پہنچا دی ہے۔ اور یورپ کا نسلی تعصب نوعِ انسانی کے قدرتی حقوق کے خلاف دنیا کی ایک عالمگیر مصیبت ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کا ایک دن کے لیے بھی اپنی غلامی پر قانع رہنا فی الحقیقت کسی قوم کی غلامانہ برداشت کی انتہا ہے۔ افسوس کہ ہمیں معلوم نہیں ہماری بدبختی کی یہ برداشت کب تک جاری رہے گی۔ میں امید کرتا ہوں اس وقت ہم میں ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کا وفد موجود ہے۔ میں آپ کی جانب سے انہیں یقین دلاؤں گا کہ ہم اگرچہ اپنی بدقسمتی کی وجہ سے آج بے دست و پا ہیں۔ تاہم میں ایک دل بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے سمندپار کے بھائیوں کی اس مصیبت کے احساس سے خالی ہو۔ ہم ان کی جدوجہد میں اپنی تمام ممکن قوتوں کے ساتھ شریک ہیں :

حضرات! ہندوستان سے باہر کے بعض تازہ حوادث بھی نہ صرف سال رواں میں۔ بلکہ اس پورے دور میں اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے یادگار رہیں گے۔ عنقریب تاریخ اِن مختلف عنوانوں سے ان کی داستانیں مرتب کرے گی :

بالآخر موصل کے قضیہ کا نام نہاد مجلس اقوام نے فیصلہ کر دیا۔ یہ مجلس برطانیہ اور فرانس کی مدبرانہ قوتوں کا جلیوا میں ایک نیا دفتر ہے اس لیے اس کا فیصلہ انصاف کے کتنے ہی خلاف ہو۔ لیکن توقع کے خلاف نہیں ہے۔ امید نہیں ترکی حکومت اس صریح جبر و نا انصافی کو جو اس کی ترکی آبادی در قبہ کا ایک ٹکڑہ اس سے الگ کر دیتی ہے منظور کر لے۔ اگر ترک جنگ پر مجبور ہوئے تو جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ ایک بات بالکل صاف ہے ہندوستان اپنی تمام موجودہ کمزوریوں اور غفلتوں کے ساتھ بھی اس غلطی کا دوبارہ مرتکب نہیں ہو سکتا۔ جس میں وہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک مبتلا رہ چکا ہے۔

وہ یقیناً اس سے انکار کر دے گا کہ اس کی مادی اور اخلاقی قوتیں آئندہ کسی ایسی جنگ کے لیے استعمال کی جائیں جس کا مقصد محض برطانی شہنشاہیت کے جابرانہ اغراض ہیں۔ یقیناً ہندوستان کے بدقسمت مسلمان اب اس کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ برطانی شہنشاہیت کے لیے ان ترکوں کے سینوں پر گولیاں چلائیں جو اپنے قومی و وطنی حق کی حفاظت کے لیے دفاع پر مجبور ہوئے ہیں ؂

سرزمین شام کی وحشیانہ بربادی خصوصاً دمشق اور اس کے بے گناہ باشندوں کا ہولناک قتل عام شاید نوعِ انسانی کے لیے موجودہ عہد کا سب سے زیادہ ماتم انگیز واقعہ ہے۔ عظیم و جمیل دمشق جو دنیا کی تاریخی آبادیوں میں سے ایک ہے۔ جس کا چپہ چپہ تاریخِ مشرق کے بیش قیمت آثار کا دفینہ ہے۔ جو ایک صدی تک اسلام کے شاندار عہدِ عروج و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے۔ جس کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک زمانہ میں حافظ ابن عساکر کو اسّی ضخیم جلدیں لکھنی پڑی تھیں۔ اب ایک منہدم کھنڈر ہے اور متصل بہتر گھنٹہ کی گولہ باری نے جو کسی میدانِ جنگ کے لیے بھی ایک ہولناک بلا کی تھی اسے انسانی قتل و غارت کا ایک وسیع مدفن بنا دیا ہے۔ نسلِ انسانی کی یہ تازہ ترین ہلاکت کن ہاتھوں سے انجام پائی ہے؟ فرانس کے ہاتھوں سے! اس فرانس کے ہاتھوں سے جس نے اپنے انقلاب کی زبانی نوعِ انسانی کو حقوق مساوات اور آزادی کا پیغام دیا تھا، اور جس کے روسو، والٹیر، میرابو، اور لافیٹ، وکٹر ہیگو، کے لفظوں میں نسلِ انسانی کے مقدس نجات دہندہ تھے ؂

حضرات! تاریخِ عالم کے موجودہ عہد کی اس ہولناک بربریت کے ذکر کے بعد جو نوعِ انسانی کی اس نجات دہندہ قوم کے ہاتھوں انجام پائی ہے آپ قدرتی طور پر منتظر ہوں گے کہ اب میں فوراً دنیا کی اخلاقی زبان کے وہ تمام الفاظ بول جاؤں جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر بولے جاتے ہیں۔ میں انسانیت کا ذکر کروں، انسانی

حقوق اور انصاف کی پامالی پر ماتم کروں، اور کم از کم یاد دلاؤں کہ نام نہاد لیگ آف نیشنز اور یورپ کی فیاضانہ اور مربیانہ عکبرداری کے نتائج یہ ہیں جو بد قسمت مشرقی اقوام کے حصہ میں آتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ قطعاً بے سود ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک معلوم و محسوس حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ میں انسانی ظلم و حرص کی اس ہولناکی کا ذکر کر سکتا ہوں جو موجود ہے لیکن انسانی تہذیب و انصاف کی ان امیدوں کا کیوں ذکر کروں جن کا فی الحقیقت کوئی وجود موجود ہی نہیں ہے ؛

انسانی ظلم و ناانصافی ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہے۔ اس لیے ہم اس کے نتائج دیکھ رہے ہیں۔ لیکن انسانیت اور انصاف کہاں ہے جس کی پامالی پر متعجب ہوں، طاقت نے کمزوری اور عقلمند کے ساتھ کب انصاف کیا ہے کہ آج کرے گی؟ ہر انصاف جس کا مطالبہ کمزوری کرے رحم ہے۔ اور اس دنیا میں تو ہمیں رحم کیا کرنے۔ یہاں صرف طاقت اور ضرورت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اور اسی کا نام انصاف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حقیقت کے خلاف ہر فریبِ خیال سے انکار کر دیں!

سرزمینِ حجاز کے حوادث میں جہاں ایسے نتائج موجود ہیں جو عجب نہیں تاریخ اسلام کے لیے ایک نئے دورِ اصلاح و ترقی کا دروازہ کھولیں وہاں ہمارے لیے باشندگانِ حجاز کے مصائب کا تصور بھی کچھ کم المناک نہیں۔ شریفی حکومت جس کا وجود اسلام اور عرب کے لیے موجودہ عہد کی سب سے بڑی مصیبت تھی، اپنا آخری لمحۂ حیات بھی ظلم و استبداد کے بغیر بسر نہ کر سکی۔ مدینہ منورہ کے ہزاروں باشندے فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر شہر سے نکل گئے اور اس وقت حجاز کے ساحلی مقامات میں خانہ ویرانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ؛

ہمارے وفدِ حجاز نے ان کے مصائب کا دردانگیز پیام مسلمانانِ ہند کے نام بھیجا ہے میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاؤں گا کہ تمام خلافت کمیٹیوں کے

ذریعہ کوشش کی جائے کہ آئندہ حج کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں حجاج روانہ ہوں اہلِ حجاز کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر موسمِ حج کی رونق و کثرت پر ہے جس قدر زیادہ حاجی جائیں گے اسی مناسبت سے ان کی اقتصادی حالت سال بھر تک بہتر رہے گی ؛

لیکن حضرات ! ان المناک حالات کی تاریکی میں امید اور مراد کی روشنی بھی کیسی تابندہ و نمایاں ہے ، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آثار اپنے پیچھے کیسا روشن طلوع رکھتے ہیں ؛

شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی فتحمندیاں حق و آزادی کے معجزات باہرہ میں سے ایک تیار معجزہ ہیں ۔ اسپین کی تنہا فوجی طاقت جب بار بار ٹکرا کر رہ گئی تو فرانس اور اسپین نے اپنی متحدہ قوت کا اسے نشانہ بنایا ۔ مٹھی بھر بے سر و سامان قبائل اور موجودہ عہد کی دو متمدن خونریز طاقتوں کا مقابلہ دنیا کے لیے ایک نظارہ تھا ، تاہم جو نتائج نکلے وہ ہمارے سامنے ہیں ۔ اس وقت تک ایک بالشت بھر زمین بھی ریفی علاقہ کی مسخر نہیں کی جا سکی ۔ اور عجب نہیں بہت جلد حق و باطل کا آخری فیصلہ ہو جائے ۔ اسی طرح شام میں شجاع اور جانفروش دروزیوں کی قومی حرکت کیسی شاندار اور امید افزا ہے ۔ بہادر دروزیوں کی حرکت پہلے صرف جبل حوران کے قبائل ہی میں محدود تھی لیکن دمشق کی ہولناک بربادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تمام آبادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ہے ۔ غوطہ کے مرغزاروں سے لے کر جبلِ حوران کی سنگلاخ گھاٹیوں تک استقلال یا موت کا نعرہ بلند ہے ۔ نہیں کہا جا سکتا آئندہ حالات کیا صورت اختیار کریں ۔ تاہم یہ تو واضح ہے کہ شام نے اپنے مقصد کی طرف عزم و ہمت کا قدم اٹھا دیا ہے ۔ ضروری نہیں کہ یہ سفر جلد طے ہو ۔ لیکن ضروری ہے کہ طے ہو ۔ اور اب یا کسی قریبی مستقبل میں منزلِ مقصود تک پہنچ جائے ۔ ہندوستان بھی اسی منزل کا پاشکستہ رہرو ہے ۔ اس کے دل کی آرزو مندیاں اور روح کی بے چینیاں اپنے برادرانِ شام کی کامیابیوں کی راہ تک رہی ہیں ؛

ایران کے نئے انقلاب میں خاندانِ قاچاریہ کی شاہیت کا خاتمہ یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جس کا تمام مشرق خیر مقدم کرے گا۔ یہ سلسلۂ حکومت ایران کے عہدِ تنزل کی پیداوار تھا۔ اس لیے شخصی حکومت کے بدترین مفاسد اس کے خمیر میں داخل تھے۔ اس کی پوری تاریخ اس عظیم سرزمین کے مصائب کی مسلسل داستان ہے یہ داستان جس قدر جلد ختم ہو جاتی بہتر تھا۔ لیکن دنیا کو عرصہ تک انتظار کرنا پڑا البتہ یہ انقلاب کیسا شاندار اور مکمل ہوتا۔ اگر ایک نئی شاہیت کے آغاز کی جگہ ہم ایران کی جمہوریت کا اعلان سنتے؛

خاندانِ قاچاریہ کے عزل کے بعد دنیا کو قدرتی طور پر اسی کا انتظار تھا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی تاریخ نے تعجب انگیز صورت میں اپنا ایک مشہور باب دہرا دیا اور ایران کے جمہوری مواد سے اچانک ایک نیا تاج و تخت شاہی آراستہ ہو گیا۔ بہر حال ایران کے لیے ترقی کا ایک قدم ضرور ہے۔ آج اس کا تاجِ شاہی اس کے طاقتور اور صاحب عزم رہنما کے سر پر ہے اور تاریخ منتظر ہے کہ اس واقعہ کے نتائج کا فیصلہ کرے؛

حضرات! آیئے اب وقت کے سب سے آخری مگر سب سے اہم واقعہ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ سرزمینِ حجاز کے عظیم الشان انقلاب کی تکمیل ہے۔ مدینہ منورہ میں نجدی فوجیں امن و امان کے ساتھ داخل ہو چکی ہیں اور جدہ کی تسخیر کی بھی تصدیق ہو گئی ہے۔ اب شریف حسین کے فتنہ سے یہ سرزمینِ مقدس پاک ہو گئی۔ اور اس طرح وہ عظیم الشان اسلامی خدمت مکمل ہو گئی جس کا شرف قدرتِ الٰہی نے امام عبدالعزیز آل سعود کے نام لکھ دیا تھا؛

فی الحقیقت نجدی افواج کا حجاز میں داخلہ اس سے کہیں زیادہ اہم واقعہ ترتیب دے رہا تھا جس قدر دنیا کی نگاہوں نے تصور کیا تھا۔ اب نہ صرف سرزمینِ حجاز بلکہ

جزیرۃ العرب کے لیے بالکل ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ عرب کا سب سے بڑا انسان ہمارے سامنے نمودار ہو گیا ہے اور ایک عظیم مستقبل اس کے عقب میں ہے۔ اب صدیوں کے بعد مسلمانانِ عالم کو موقعہ ملا ہے کہ سرزمین حجاز کی تجدید و اصلاح کے خواب کی تعبیر ڈھونڈیں۔ اگر مسلمانانِ عالم کی رائے عامہ نے اس انقلاب حال کی قدر و قیمت محسوس نہ کی تو عجب نہیں وہ تاریخ کی نظروں میں ایک بہت بڑی فرصتِ عمل ضائع کر دینے کے مجرم ثابت ہوں ؂

حضرات! قبل اس کے کہ میں آپ کو وقت کے اہم کاموں کی طرف توجہ دلاؤں چند الفاظ اس بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ ہماری ملکی سرگرمیوں میں خلافت کمیٹی کی نوعیت کیا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں صاف اور واضح خیالات کی ضرورت ہے، خلافت کمیٹی جس وقت قائم ہوئی تو دو مقصد اس کے پیش نظر تھے۔ مسئلہ خلافت کے لیے ملک میں عام جد و جہد قائم رکھنا۔ اور مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ ملکی آزادی کے لیے سرگرمی پیدا کرنا۔ اس آخری مقصد کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ اس کی راہ میں مسلمانوں کے قدم بہت پیچھے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ ایک جماعت ان میں سرگرمی پیدا کرتی رہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے۔ کوئی ایسی جد و جہد موجود نہیں ہے جس کے لیے تمام ملک میں ایک مستقل نظام کی ضرورت ہو۔ اور جو مسائل در پیش ہیں ان کے لیے صرف مرکزی کمیٹی کافی ہے۔ باقی رہا دوسرا مقصد تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے بھی اب ضروری نہیں کہ خلافت کمیٹی کے نام سے تمام صوبوں اور ضلعوں میں کوئی نظام قائم رکھا جائے۔ مسلمانوں میں جو لوگ ملک کی موجودہ افسردگی اور ہندو مسلم نا اتفاقیوں سے پریشان خاطر ہو چکے ہیں وہ تو آگے کی طرف دیکھنے کے لیے کوئی نگاہ نہیں رکھتے۔ اور جب پیچھے دیکھتے ہیں تو انہیں خیال ہوتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی

جگہ سے ہٹ کر کیوں نہ کوئی نیا نظام قائم کر لیا جائے یا کم از کم کوئی پچھلا نظام ہی کیوں نہ از سر نو زندہ کر لیا جائے۔ جن لوگوں کی پریشان خاطری اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ اپنے گزشتہ اصول و عقائد سے دست بردار ہو جائیں وہ اگرچہ دوسرے مقصد سے انکار نہیں کرتے۔ تاہم وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ کہ اگر خلافت کمیٹیوں کے لیے ملک کے اندر کوئی معین اور جاری کام نہیں ہے تو پھر یہ پورا کارخانہ کیوں کر قائم رکھا جا سکتا ہے اور اگر نہیں رکھا جا سکتا تو کیوں قائم رکھا جائے ۔

حضرات! مجھے آخری خیال کے وزن سے انکار نہیں مگر میں پہلے سے بھی متفق نہیں ہو سکتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہاں تک باہر کے اسلامی مسائل کا تعلق ہے معاملات نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ ان کے لیے صرف مرکزی خلافت کمیٹی بھی کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے اس سے انکار ہے کہ ہندوستان کی سیاست و عمل کی زندگی میں مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا چاہیے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالت موجودہ اگر وہ کارکن حلقہ باقی نہ رہا جو خلافت کمیٹی کے نام سے پہچانا جاتا ہے تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور گزشتہ تحریک نے اعتقاد و عمل کی جو ایک خاص آب و ہوا پیدا کر دی ہے وہ ایک عرصہ تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ غور کیجیے کہ موجودہ صورت حال کیا ہے؟ خلافت کمیٹی کو صرف اس کے نام میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ نام تو صرف اس تختی کا سوال ہے جو اس کے دروازے پر لٹکا دی جاتی ہے در اصل خلافت کمیٹی مسلمانوں کے اس کارکن حلقہ کی نمائندگی کرتی ہے جس کے عقائد و اعمال کی چند خاص خاص خصوصیتیں ہیں اور انہی خصوصیتوں کی بنا پر اس کا ایک خاص حلقہ ملک میں قائم ہو گیا ہے۔ یہ حلقہ مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی میں ۱۹۲۰ء کی ایک نئی کڑی پیدا کرتا ہے جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک دماغی تغیرات کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اگر یہ کڑی نکال دی جائے تو مسلمانوں کی سیاسی و عملی

سرگرمی کی رفتار ترقی میں سے ایک منزل گم ہو جائے گی جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس حلقہ کی بڑی خصوصیات جو اسے دوسرے حلقوں سے ممتاز کرتی ہیں یہ ہیں کہ یہ ہندوستان کی آزادی و نجات پر جو متحدہ قومیت کے ذریعہ حاصل ہو گی یقین رکھتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کی بدقسمتی اس کام میں کتنی ہی دشواریاں پیدا کر دے۔ لیکن وہ طیار نہیں۔ کہ اس نصب العین سے دست بردار ہو جائے۔ وہ مسلمان کے جماعتی حقوق و فوائد کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے لیکن اس طریقِ عمل سے انکار کرتا ہے۔ کہ مسلمان ہندوؤں کے طرزِ عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑ لیں اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔ اگر ہندوؤں سے انہیں منصفانہ طرزِ عمل کا مطالبہ کرنا ہے تو پوری قوت سے کرنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملکی جنگ کے میدان سے ہمیشہ الگ رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عمل اور سرگرمی کے ان ابتدائی اور بے سود طریقوں پر وہ قطعاً اعتقاد نہیں رکھتا جنہیں ۱۹۳۰ء کی تبدیلی کا دروازہ بند کر چکا ہے۔ کوئی میدان ہو وہ یقین کرتا ہے کہ جد و جہد کی اصل روح قربانی و ایثار اور عملی اقدام ہے۔ گزشتہ تحریک ملک کی قوتِ عمل کے لیے ایک پورا امتحان تھی جن جن قدموں میں چلنے کی سکت تھی وہ چل اٹھے۔ جو نہ چل سکے انہوں نے ثابت کر دیا کہ اسباب کچھ ہوں لیکن ان کے لیے چلنا مشکل ہے۔ اب جو حلقہ مسلمانوں میں ہر جگہ خلافت کمیٹی کا حلقہ سمجھا جاتا ہے یہ گویا مسلمانوں کی موجودہ قوتِ عمل کا خلاصہ ہے۔ اگر موجودہ دور میں کسی طرح کی بھی عملی سرگرمی جاری رکھنی ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ اسی مواد سے کام لیا جائے۔ اس سے باہر کوئی ایسا مواد موجود نہیں جو کسی طرح کی عملی سرگرمی شروع کر سکے ؎

میں اس وقت دلائل اور تفصیل سے کام نہیں لوں گا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں ہر صاحبِ شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کیا آپ اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے

کہ مسلمانوں میں اعتقاد اور فکر کا یہ مذہب (اسکول) قائم رکھنا چاہیے؟ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس کی ضرورت ہے اور اگر یہ حلقہ سر دست اپنی جگہ خالی کر دے تو صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خالی رہے گی بلکہ ایسی جماعتیں آگے بڑھ آئیں گی جن سے نہ تو کسی طرح کی صحیح عملی سرگرمی کی امید کی جاسکتی ہے، نہ وہ آگے کی طرف کوئی نگاہ رکھتی ہیں۔ اگر موجودہ انتشار اور افسردگی کے وقفہ میں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم انہیں پیچھے تو نہیں دیکھنا چاہیے؛

البتہ ایک مسئلہ کا فیصلہ ناگزیر ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ اس کا فیصلہ کر لیں کہ آپ کے لیے اہم ترین کام خود ہندوستان کے اندر کی زندگی اور اس کی ضروریات ہیں یا نہیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو، تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ اس راہ میں کوئی معین اور عملی قدم اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے پانچ سال تک ہندوستان کے باہر کے اسلامی اور مشرقی مسائل کے لیے جد وجہد کی اور جس قدر نتائج اس سے نکل سکتے تھے۔ حاصل ہوئے لیکن موجودہ صورتِ حال کیا ہے۔ یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کے اندر بدستور قید وبند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی حالت صرف آپ کی نجات کی راہ ہی میں نہیں بلکہ تمام ایشیا اور مشرق کی راہ میں روک ہے۔ پس ضروری ہے کہ آپ کی قوتیں اب ملک کی اندرونی خدمات کے لیے وقف ہو جائیں۔ بہ حیثیت ملک کی ایک بڑی جماعت کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور عام دماغی اصلاح وترقی کا کام ہر حال میں ایک مقدم اور ناگزیر ہے۔ اگر ملک کے سامنے سیاسی حرکت کے لیے کوئی عملی پروگرام موجود نہیں اور بحالتِ موجودہ جس قدر بھی سرگرمی جاری رکھی جاسکتی ہے اس میں انڈین نیشنل کانگرس مشغول ہے۔ تو چاہیے کہ یہ موقعہ ہم کسی صحیح تعمیری کام میں صرف کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے ۱۹۲۰ء کی حرکت سے پہلے کوئی مہلت ایسی نہیں پائی کہ عوام کی اصلاح وترقی کے لیے چار پانچ سال تک کوئی بھی سرگرمی جاری رہی ہوتی۔ اس کا افسوسناک نتیجہ آج ہم اس ردعمل (ری ایکشن) میں دیکھ رہے ہیں۔ جس نے اچانک تمام ملک کو انتشار اور افسردگی کے حوالہ

کر دیا ہے۔ اب اگر ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم آئندہ چند سالوں میں وہی کام انجام دے لیں جو گزشتہ چند سالوں کے اندر نہیں کیا گیا۔ اگر ہم اس کام میں تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کر سکتے تو یہ مسلمانوں کے لیے بہ حیثیت ایک جماعت کے اور ملک کے لیے بہ حیثیت مجموعی ایک عظیم الشان خدمت ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ اس کام کا ایک بڑا ٹکڑا جو بغیر کسی جماعتی خصوصیت کے کیا جا سکتا ہے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن اگر کانگریس سر دست کوئی ایسا کام شروع نہیں کر سکتی تو ملک کی تمام جماعتوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حلقوں میں شروع کر دیں۔ اگر خلافت کمیٹیوں کا نظام کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے تو پھر میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ ان کے غیر ضروری ہونے کا کوئی سوال درپیش نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ آپ نے گزشتہ سال پروگرام منظور کیا تھا جو آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے اس کام کی متعدد دفعات جمع کی گئی ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی موجودہ شکل میں آپ کے لیے مفید عمل ہو سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ سب سے پہلے اس پہلو پر غور کریں کہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح و ترقی کے لیے بنیادی سطح کونسی ہے اور پھر کوئی ایک معین اور واضح اور سہل العمل قدم اس طرف اٹھا دیں۔

تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ہر حال میں مقدم کام عوام کی تعلیم ہے۔ یہی کام سب سے زیادہ ضروری ہے اور اسی طرف سے ہمیشہ اغماض کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لفظ کو یہاں اس کے زیادہ وسیع معنوں میں لیجیے۔ تعلیم سے مقصود صرف وہ تعلیم ہی نہیں ہے جو قواعد اور منضبط اصول کے ذریعہ مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی ہے یہ تو دراصل آنے والے عہد کے لیے ہے۔ جنہیں آج پڑھایا جا رہا ہے وہ کل کام کریں گے۔ لیکن قوم کو اس کی موجودہ حالت میں بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کی دماغی حالت اور عملی استعداد درست کی جائے۔ وقت کی تمام مشکلات کا یہی علاج ہے۔

ہم عوام میں باہمی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے۔ عملی سرگرمی ابھار نہیں سکتے۔ حیثیت کی

تکلیفیں دور نہیں کر سکتے ، وقت کی ضروریات کا احساس پیدا نہیں کر سکتے جب تک ان کے فہم و استعداد کے مطابق ان سے ہمارا ایک دائمی ذریعہ خطاب و درس قائم نہ ہو جائے ۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ، موجودہ نسل میں جس کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ گزر چکا ہے ۔ نوشت و خواند کی تعلیم عام کرنا اور باقاعدہ و مرتب تعلیمی اسباق کے ذریعہ جو مذہبی اور اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات پر مشتمل ہوں عوام کی جماعتوں کو مسلسل تعلیم دینا ؛

اگر ہم نے ان پڑھ عوام کی ایک بڑی تعداد میں اتنی استعداد پیدا کر دی کہ وہ اٹک اٹک کر اُردو عبارت پڑھ لیں ۔ اور غلط سلط اردو لکھ لیں تو آپ یقین کیجیے کہ ہر طرح کی اصلاح و ترقی کے دروازے جو کسی حال میں بھی نہیں کھل سکتے تھے ہم نے یک دفعہ ان پر کھول دیے ، اسی طرح اگر ہم نے ۱۹۴۶ء میں کم از کم اتنا بھی کر لیا کہ ہم ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری تعلیم لکچروں کے ذریعہ عوام کے مختلف حلقوں کو دیتے رہے ، اس کی مسلسل صدائیں ان کے دلوں تک اترتی رہیں اور اس طرح کارکن حلقہ میں اور عوام میں روزانہ خطاب اور مقابلہ کا تعلق قائم ہو گیا تو غور کیجیے کہ ۱۹۴۷ء کی جماعتی استعداد سے ۱۹۴۶ء کس درجہ مختلف ہو گا ؛

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سر دست صرف یہ تعلیمی پروگرام اختیار کرنا چاہیے ، اور اس میں بھی چار چیزوں پر قناعت کر لینی چاہیے ؛

۱۔ عوام کے موجودہ طبقہ میں نوشت و خواند کی اشاعت اور اس کے لیے نائٹ سکول کا قیام ۔ اکثر صورتوں میں ان کے لیے مساجد کافی ہیں ؛

۲۔ عوام کی مذہبی ، اخلاقی ، اور معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایسی تعلیم گاہوں کا اجرا جہاں مرتب و مسلسل لکچروں کے ذریعہ اس طرح تعلیم دی جائے کہ ہر مہینے کا ایک معین کورس ہو اور اس میں ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری معلومات موجود ہوں ۔ اس کے لیے بھی اکثر حالتوں میں مسجد بہترین محل ہے ؛

۳۔ جہاں تک ممکن ہو عوام کے لیے قرأت خانوں (ریڈنگ روم) کا قیام ؛

ہم کوشش کی جائے کہ جمعہ کے خطبات کی اصلاح ہو اور ان کے ذریعہ ضروری اور مفید تعلیم ہفتہ وار سامعین کو مل سکے ؛

اس پروگرام کے نفاذ کے لیے لکچروں اور خطبوں کی ترتیب واشاعت ضروری ہے اور اس کا خود مرکزی خلافت کمیٹی کو انتظام کرنا چاہیے ؛

حضرات! روپیہ کی فراہمی کے لیے بھی اس وقت تک جو طرزِ عمل چلا آتا ہے میں سمجھتا ہوں اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ بغیر روپیہ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک چل نہیں سکتی کہ عوام سے روپیہ کی مسلسل طلبی بھی جاری ہے اور کام کا اعلان و وعدہ بھی ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اب ایسا طرزِ عمل اختیار کریں کہ لوگوں کو روپیہ دینے اور اس کے نتائج تولنے کا صحیح طور پر موقع مل سکے۔ اگر آپ اس سال عملی سرگرمی پیدا کرنی چاہتے ہیں تو چاہیے کہ روپیہ کی مسلسل طلبی و وصولی کا طریقہ ملتوی کر دیجیے۔ آج یہاں طے کر لیجیے کہ ۱۹۳۶ء کے کاموں کے لیے خصوصاً اس تعلیمی پروگرام کے لیے آپ کو کم از کم کس قدر روپیہ چاہیے۔ اس کے بعد سال کی پہلی سہ ماہی صرف اس رقم کی طلبی و وصولی کے لیے وقف کر دیجیے۔ خلافت کمیٹی کا تمام نظام تین ماہ تک صرف اسی کام میں مشغول رہے۔ اس عرصہ میں پبلک کا فرض ہے کہ وہ آپ کو روپیہ دے اور اس کا مطالبہ نہ کرے کہ آپ کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد کے نو ماہ خالص عمل اور مشغولیت کے ہونے چاہئیں۔ ان نو مہینوں کے ہر دن کے لیے آپ پبلک کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ سال کے خاتمہ پر وہ فیصلہ کر سکے گی کہ کس قدر روپیہ آپ کو دیا گیا تھا اور کس قدر کام آپ نے انجام دیا ؛

حضرات! ۱۹۳۶ء کا دوسرا اہم کام آپ کے لیے مجوزہ مؤتمر حجاز ہے جس کا پیام دعوت امیر عبدالعزیز آل سعود کی جانب سے تمام عالم اسلامی کو دیا جا چکا ہے اور خصوصیت کے ساتھ آپ کے نام بھی پہنچ چکا ہے ؛

مؤتمر حجاز بجائے خود ایک ضروری کام ہے۔ لیکن حجاز کے مسئلہ کے اس کی ضرورت اور

زیادہ اہم کردی ہے۔ تاریخِ اسلام کو صدیوں کے بعد موقعہ ملا ہے کہ سرزمینِ حجاز کی اصلاح و عمل کے لیے مستعد دیکھے۔ اس دور کے آغاز کے لیے سب سے پہلا کام موسم حج میں مؤتمر اسلام کا انعقاد ہے۔ ہمارا وفد اس وقت حجاز میں موجود ہے اور امید ہے کہ اس باب میں اس کے ذریعہ عنقریب مفصل اطلاعات موصول ہوں گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض اہم خدمات کے انصرام میں مرکزی خلافت کمیٹی کو نمایاں حصہ لینا پڑے۔ امید ہے کہ مسلمانانِ ہند کی رائے عامہ ہمیشہ اس کی اعانت میں سرگرم رہے گی۔

حضرات! آخر میں میرے لیے صرف یہ رہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توفیقِ عمل کے لیے دست بدعا ہوں۔ اگر ہماری نیتیں اخلاص سے اور ہمارے قلوب عزم سے خالی نہیں ہیں تو ہمیں راہ کی مشکلات پر نہیں بلکہ رہنمائے حقیقی کی دستگیری پر نظر رکھنی چاہیے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً۔

انڈین نیشنل کانگرس ـــــــ رام گڑھ

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اسکا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہوتے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ قومی جد و جہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ہمارا سفر دور تھا اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرتے ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا۔ مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھاتے اور سامنے کی

طرف دیکھیے نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں ہے البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے وہاں طرح طرح کی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دیں اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش ان کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزلِ مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے۔ ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے بھروسہ کا اظہار کیا ہے۔ وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسہ ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے یہ بہت بڑی عزت ہے اِس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لیے شکر گزار ہوں اور ذمہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرم جوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے ویسے ہی گرم جوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی ؛

اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیے۔ ہمارے وقت کا سب سے پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں ؛

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک ملبنی تجویز منظور کر کے اُس کانگریس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا۔ اور اس کے بعد سے وہ کانگرس کے سالانہ اعلان کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا ؛

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا

سب سے پہلی بات جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم بی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانہ کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے۔ اور فکر و عمل کی لہریں ایک گوشے میں ابھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں۔ ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلہ کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی (REACTIONARY) اور ملک گیری کی تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں۔ ہندوستان انہیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کا دل و دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فاشی ازم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا تو ہمارے لیے ناممکن تھا کہ ہم اس پرانے خطرے کو بھلا دیتے جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے اسے ہم نئی ارتجاعی قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول

دی گراگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے آزاد اور لوٹے ہوئے آزادپسندی سے محروم کر دیا گیا ہے اس میں حصہ لینے سے قاصر رہے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے جب کہ اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہے اور ہندوستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ ایسی حالت میں برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد کرے ؛

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں ؛

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لیکر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور رہیں ؛

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو لڑائی بھی شروع ہو گئی ؛

اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکوں گا اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑکر دیکھیے پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے ؛

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دیدی ہے کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے ؛

تاہم اس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا اور اس پر آمادہ ہو گئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کو قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت

حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے۔ ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت MENTALITY میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی DIPLOMACY ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت محسوس کرے گی کہ اس موقعہ پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے اور ہندوستان کو ایسا کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا ہے۔ تبدیلی کی ذرا سی پرچھائیاں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہ دیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے اس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا؛ اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجہ تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو۔ لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دیا جاتا جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ویلرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر کا سوال قابلِ اطمینان طریقے پر طے نہیں ہوتا۔ وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے! جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں DOMINION کا درجہ STATUS ملنے والا ہے اس ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاندار سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رخ کو ہم اس کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں ہمیں جلدی نہیں کرنا چاہیے ابھی اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم اسے اور زیادہ نزدیک سے نزدیک اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے۔

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشے میں سلگی تھی اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر بالآخر پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نقطے دنیا کے سامنے آئے اور ان کا جو کچھ حشر ہوا دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِ فعل REACTION شروع ہو جائے؛ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نازسزم کا روپ اختیار کیا اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت DICTATORSHIP دنیا کے امن و آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی۔ دوسری ارتجاعی قوتوں کو آگے بڑھانے والی اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فیشسٹ اٹلی اور نازسی جرمنی سے زیادہ کہیں زیادہ سویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی۔ تین برس تک اس منظر کا تماشہ دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ

اور نازی قوتوں کی جراتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابی سینا، اسپین، آسٹریلیا، چیکوسلاواکیہ اور البانیہ کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انہیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا۔ اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا کیونکہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوتوں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ جمہوریت، آزادی، اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ر ستمبر کا اعلانِ جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے یورپ کی بوڑھی ارتجاعی REACTIONERY قوتوں کی وحشیانہ زورہ آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں ان خوشنما صداؤں پر کان لگادیے۔

۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا اور ۷ر ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اور جعل نہیں تھا یقیناً اسے ملامت نہیں کیا جاسکتا اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کردیتی جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضا کررہے تھے اپنے کانوں کو بند کرلیا۔ اس نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کرکے وہ قدم اٹھایا جسے آج ہندوستان سر اٹھاکر دنیا سے کہہ سکتا ہے کہ اس صورتِ حال میں اس کے لیے یہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کردیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے۔ جس پر نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سلسلے مقصدوں کا

فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی TRAGEDY کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے۔ اور یہ واقعی اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ آزادی جمہوریت اور ان کے نئے نظم ORDER سے دنیا کو آشنا کیا جائے تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبہ کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے کہ خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اس مطالبہ کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ میں آنے والے مورخ سے کوئی بیجا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت کا ایک سادہ مگر ناقابلِ رد نوشتہ ہے جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی۔ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ چکی ہیں مبتلا کی گئی اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جاتے۔ کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ، ہتھیاروں کی حد بندی، بین الاقوامی پنچایت کا قیام یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں لگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی۔ ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا۔ آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہونا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے

کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے ؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا ؟

کانگریس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے ۔ اس سلسلہ کے لیے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا ۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علم و ادب کے الجھے ہوئے انداز اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے ۔ صفحے کے صفحے پڑھا جانے کے بعد بھی اس قدر بتانے میں مشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے ۔ جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے ۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے ۔ جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے ۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی ۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی ۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کر سکتا ۔ اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا ۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا وہ اس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے :

"ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کر لے ۔ کمیٹی کانگریس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے ، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں ۔"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا ۔ یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا

تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ ترقی کر کے کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونک جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انہوں نے ۶ فروری کو شائع کیا اس کی آخری کڑی کہی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو۔ برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرے اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے۔ اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لیے خود اختیار فیصلے کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت نے دکھا دیا کہ سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا۔ پچھلے چار مہینوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں مگر جوں ہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آ جانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے۔ مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں۔

ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی ؛

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقعہ پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانوی نہیں ہے بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا ۔ اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا ۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں ۔ اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنہیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے ۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے ۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا ۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے ؛

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی سوال کے حق نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے ؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے ۔ کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنیا کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پھٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے ۔ ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے ؟ اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں ؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی وہ اب بھی اپنے سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے ۔ ہمیں یقین

دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے، اس سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوال کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لیے صورت حال بالکل واضح ہو گئی ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں ہماری راہ یقیناً بالکل اسکے مقابل سمت جا رہی ہے۔

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں جہاں سے ہم چلے تھے ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳، ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا رُخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اُسے حرف زبان تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں۔ میں آپ کے دلوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون کا جو قدم ۳۷ء میں اٹھایا تھا۔ ہم نے اعلانِ جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے وہ رک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم

پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے ۞

اس سلسلہ میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جب کہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں۔ مگر غلبہ جمانے والی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں۔ کہ یورپ کی نئی ارتجاعی قوموں نے کس طرح انسانوں کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ و بالا کر دیے اور انصاف اور معقولیت کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رخ ابھار رہی ہے۔ وہاں امید کا ایک دوسرا رخ بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف ابھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا اب وقفہ بہ وقفہ دماغوں اور زبانوں کی سطح پر ابھر رہی ہے اور ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا۔ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنہیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا آئندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جائیں معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام

دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے ؛

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے۔ مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے اور وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا سا بھی کمزور محسوس کریں بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ برطانوی کابینہ کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا۔ اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن و انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعووں کے لیے ایک کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے ؛

جہاں تک وقت کے اصلی سوالوں کا تعلق ہے معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلانِ جنگ کے بعد کانگرس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکے گا۔ بلاشبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے ہندوستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے مخالفت

کرنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں، وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضا سے بے بس ہو رہی ہیں۔ اور انہیں بھی ہندوستان کی سیاسی مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیے وہاں اس گوشہ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئی کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ دارانہ مسئلہ کے ساتھ غلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے۔ بار بار دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگرچہ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلاف کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا اور ہمارے لیے اب بے سود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی چھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا۔ یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشہ میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پہلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امید دل کے رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ختم ہو گیا اسے

ابھی ختم ہونا باقی ہے ؎

بہرحال اب آپ خواہ کچھ ہی کہہ رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندر کوئی مسائل رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ کر اٹھے گا یقیناً ایک غلط قدم ہوگا لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہ نہیں ہونے چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حقوق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے۔ وہ یہی گوشہ ہے ؎

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اول دن سے دعویٰ رہا ہے کہ وہ ہندوستان بحیثیتِ مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے ہندوستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگریس نے یہ دعویٰ کرکے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈالیں ؎

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی اس کی اہمیت اس کے فیصلے

کا طریقہ کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ اس نے اس کی اہمیت کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا جس سے زیادہ قابلِ اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جا سکتا اور اگر بتلایا جا سکتا ہے تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوتے ہیں ؛

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اُسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں! میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا ؛

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا ؛

ا۔ ہندوستان کا جو دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے ؛

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں نہ کہ اکثریتیں، اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے نہ کہ کثرتِ رائے سے ؛

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے ادائے فرض کی خامیوں پر غور

کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے ؛

میں اُنیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصہ میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل بھی تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر اندر بار بار اس طرز عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی ؛

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی) کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رائے کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے ؛

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ بار بار ہمیں یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت

اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقعہ نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر لیں ؛

ہم میں فرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہییں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوتے ہیں تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے ؛

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں ؛

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے ۲۸ برس پہلے میں "الہلال" کے صفحوں میں لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی ؛

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؛ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور پر ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قوم کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اس کی جڑیں نکالی نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے

خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد NUMBER کے ساتھ نوعیت KIND کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں ایک کی تعداد دو کروڑ ہے دوسرے کی زیادہ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا لیکن یہ خیال ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر اسے ایک اقلیت فرض کر لیا جائے۔ کمزوری کا اعتراف کریں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کی نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل FACTORS کی موجودگی بھی ضروری ہے ؎

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے ؎

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح ذات پات اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یگانگی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے۔ خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزادی اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی ؎

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت

مسلمانوں کی ہے اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی بجگہ مسلم اقلیت اور اکثریت کا تصور کرتے ہیں تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کو بجگہ محض ایک اقلیت کی دکھائی نہیں دیتی وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کہ ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندوستان کا آئندہ دستورِ اساسی CONSTITUTION اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق FEDERATION کا جمہوری دستور ہوگا جس کے کل حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ، جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جنہیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مستقبل نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانوی مدبر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کود جانا چاہیے۔ جوں ہی ہم نے ایسا کیا ہم معلوم کریں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

تقریباً ۳۰ برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمانوں کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی صورت اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی

راہ نہ روک سکی میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اس کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کر لیں یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں اس کی بنیادوں تک اتریں اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب میں موقوف ہے ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان آئندہ کا کوئی وعدہ دستورِ اساسی کا کوئی تحفظ ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اور ہمیں بھی یہ خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ نہ سکے لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے۔ تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پاتے لگتے ہیں شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیاں بھی نہیں پڑ سکتی یقین، عمل، اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا وقت کا کوئی الجھاؤ۔ حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ۔ معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں ؎

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال ؎

پھینکی ہو یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے ؛

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب ۴ برس کی نظر بندی کے رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر پچیس برس گزر چکے اس عرصہ میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے سیلاب آئے۔ خیالات کی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں ؛

ہاں اب وہ پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں آگے بڑھنے کی راہ اس پر بھی مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا۔ آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا مجبور ہوں۔ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان نے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی تھی ؛

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف ہے میں انہیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا میں ان کے اخلاص و سنجیدگی سے اپیل کروں گا کہ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہ کر

طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلے کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انہیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کر لیں وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے ؛

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم اسلام کی تاریخ اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب امیری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل FACTOR ہوں۔ میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا ؛

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا یہ

گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرہ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی۔ جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا ؞

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرہ کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں ؞

گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی، تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے، ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس۔ ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر

انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر دیا۔ ہمارا پرانا لباس، تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید RENEWAL مذہب میں ضرورت ہے مگر معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے ؏

ہماری اس ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں علٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے ؏

حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا میں اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کر دوں۔ مجھے ایک بات یاد دلانے کی اجازت دیجیے کہ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے اتحاد، ڈسپلن DISCIPLINE اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد یہی ایک رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تیار کیا

اور صرف اس سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں ؞

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی وسعت دے دی ہے۔ کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں ؞